75 واں سال چھٹا شمارہ
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

تعلیم و تربیت

اکتوبر 2015ء

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے
سرورق: ''تتلیاں''

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو! جنگل میں کسی ندی میں ایک مینڈک رہتا تھا اور ندی کے کنارے ایک بل میں چوہا بھی رہائش پذیر تھا۔ دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ انہوں نے ایک وقت مقرر کیا ہوا تھا جب وہ دونوں اکٹھے ہو کر گپ شپ کرتے اور دل کا دکھ درد بانٹتے۔ ان کا آپس میں باہمی میل ملاپ اور یارانہ اتنا بڑھا کہ ایک دن مینڈک نے اپنے دوست چوہے سے دل کی بات کہہ ڈالی کہ ہماری ذہنی ہم آہنگی اور بے لوث دوستی اس قدر اہم ہے کہ اس تھوڑے سے وقت میں دل کی باتیں کرنا اور باہمی مشکلات کا مل جل کر ازالہ کرنا دونوں کے لیے ناممکن ہے، لہٰذا کوئی ایسی صورت حال نکالنی چاہیے کہ ہم زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے یا بوقت ضرورت ایک دوسرے کو مل سکیں۔ ہمارے لیے مشکل یہ ہے کہ میں پانی میں رہتا ہوں اور آپ خشکی پر رہتے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر کوئی ایسی ترکیب نکالیں کہ ضرورت پڑنے پر ہم ایک دوسرے سے مل سکیں۔

چوہے نے مینڈک سے کہا کہ میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے، اگر آپ اتفاق کریں تو ہم اپنے مسئلے کا حل نکال سکتے ہیں۔ مینڈک نے بڑی بے قراری اور دل چسپی سے کہا: ''ارشاد فرمائیں! کیا تدبیر ہے؟''

چوہے نے کہا کہ اس مقصد کے لیے اگر ہم ایک باریک رسی کے دونوں سرے ایک دوسرے کے پاؤں کو باندھ دیں اور جب ملنے کی ضرورت محسوس ہو تو اپنے پاؤں سے رسی کو کھینچیں تو پتا چل سکتا ہے کہ ہم میں رسی کھینچنے والا دوسرے کو بلا رہا ہے۔

اگرچہ چوہے کی یہ منصوبہ بندی مینڈک کو پسند نہ آئی لیکن دوستی کی خاطر اس نے سب کچھ قبول کر لیا اور یوں وہ حسب خواہش آپس میں خوب ملاقاتیں کرنے لگے۔

چوہے اور مینڈک کا وقت بہت خوشی سے گزر رہا تھا لیکن شامت اعمال کہ ایک دن چوہا اپنی بل سے باہر تھا اور کسی عقاب کی نظر اس پر پڑی تو اس نے نہایت تیزی سے اڑان لیتے ہوئے چوہے کو آ دبوچ لیا۔ چوں کہ چوہے اور مینڈک دونوں کے پاؤں باریک رسی سے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے تھے، جب عقاب اپنے پنجوں میں چوہے کو لے کر فضا میں بلند ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ رسی کے دوسرے سرے پر مینڈک بھی ساتھ بندھا ہوا، ہاتھ پاؤں چلاتا فضا میں بلند ہو رہا ہے۔ لوگوں کو ایک عجیب تماشا دیکھنے کو ملا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ عقاب نے مینڈک کو پانی میں سے کیسے پکڑ لیا، جب کہ چوہا لوگوں سے یہ فریاد کیے جا رہا تھا کہ لوگو! دیکھو، یہ سزا ناجنس اور نااہل سے دوستی کا نتیجہ ہے جس کی مجھے سزا ملی۔ خدا کے لیے محبت و دوستی میں ایسی بے قراری سے دور رہیے اور نااہل سے دوستی مت کیجیے۔

شہید ملت لیاقت علی خاں پاکستان کے پہلے وزیراعظم تھے۔ آپ یکم اکتوبر 1895ء میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک بااصول اور ایمان دار سیاست دان تھے۔ اس کے علاوہ آپ قائداعظم کے بااعتماد ساتھی تھے۔ لیاقت علی خاں کو 16 اکتوبر 1951ء کو راول پنڈی کے ایک جلسے میں اکبر نامی شقی القلب شخص نے گولی مار کر شہید کر دیا۔ انہیں پاکستان سے بہت محبت تھی۔ ان کی پاکستان کے لیے خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیشہ کی طرح ہمیں بے شمار خطوط، ای میلز اور فون کالز موصول ہوئیں۔ ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے کہ شہروں، پہاڑوں، میدانوں، صحراؤں، دور دراز علاقوں، اندرون ملک و بیرون ملک بچے تعلیم و تربیت بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ہم اپنے تمام قارئین کا پُرتپاک شکریہ ادا کرتے ہیں۔

آئندہ شمارے تک کی اجازت چاہتے ہیں۔ اپنا اور دوسروں کا بہت سا خیال رکھیے گا۔

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ ''تعلیم و تربیت'' 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 850 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)= 2800 روپے۔

حمد باری تعالیٰ

انسان کا غم دُور کرے، اس کے سوا کون
مغموم کو مسرور کرے، اس کے سوا کون
ہر شخص کو دیتا ہے سکوں کون یہاں پر
دل خوشیوں سے معمور کرے، اس کے سوا کون
وہ کون ہے جو قبر کی ظلمت سے بچائے
پیدا وہاں بھی نور کرے، اس کے سوا کون
نیکی کی محبت جو خدا دل میں نہ ڈالے
پھر نیکی پہ مجبور کرے، اس کے سوا کون
ہے کون جو ظالموں کو ظلم سے روکے
عام امن کا دستور کرے، اس کے سوا کون
وہ کون ہے جو بدحال کو خوش حال بنائے
افلاس کو کافور کرے، اس کے سوا کون
وہ کون ہے جو توبہ کی توفیق بھی بخشے
پھر توبہ کو منظور کرے، اس کے سوا کون
چنگیز و ہلاکو سے ستم گاروں کو اکثر
انصاف پہ مامور کرے، اس کے سوا کون
وہ کون ہے جو سب کا خطا پوش ہے، بزمیؔ!
ہر عیب کو مستور کرے، اُس کے سوا کون

نعت رسول مقبولؐ

تذکرہ جب کریں محمدؐ کا
مرتبہ جان لیں محمدؐ کا
پہلے بھیجیں درود ہم اُن پر
بعد میں نام لیں محمدؐ کا
بزم میں، رزم میں کہیں جائیں
ذکر کرتے چلیں محمدؐ کا
یہی تسبیح سب سے افضل ہے
نام لیتے رہیں محمدؐ کا
سینکڑوں مشکلوں کے حل کے لیے
ایک کلمہ پڑھیں محمدؐ کا
حمدِ حق ہو زبان پہ جاری
دم ہمیشہ بھریں محمدؐ کا
شرع کی پیروی کریں دل سے
سر میں سودا رکھیں محمدؐ کا
دین اسلام کا کریں چرچا
سب کو پیغام دیں محمدؐ کا

پیارے بچو! دُنیا کا سارا نظام اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے چل رہا ہے اور سب کچھ اسی کے قبضہ و قدرت میں ہے۔ ہمارا ہر چھوٹی اور بڑی ضرورت میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا بالکل فطری بات ہے۔ ہر مذہب کے ماننے والے اپنی ضروریات اور حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں لیکن دینِ اسلام میں اس کی خاص طریقے سے تعلیم اور تاکید فرمائی گئی ہے۔ قرآنِ پاک میں ایک جگہ ارشاد ہے کہ ''اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ: مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔''

(المومن:60)

اللہ رب العزت کا ہم پر کتنا بڑا احسان اور انعام ہے کہ ہمیں اپنی بلند ذات سے مانگنے کی اجازت دے دی اور پھر دعا قبول کرنے کا وعدہ بھی فرمالیا۔ اس لیے ہمیشہ دعا کرتے رہنا چاہیے۔

اگر چند بار دعا مانگنے سے مقصد پورا نہ ہو تو بھی مایوس اور نااُمید ہو کر دعا ہرگز نہ چھوڑے، کیوں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور وہ ہمارے مالک و آقا ہیں۔ بندہ ہمیشہ اپنے مالک و آقا کے تابع و مطیع رہتا ہے اور اس کے احکامات کا پابند ہوتا ہے اور اپنی ضروریات کا اسی سے سوال کرتا ہے۔ پس ہمارا کام دعا مانگنا اور اس کے سامنے عاجزی ظاہر کرنا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق فیصلہ فرماتا ہے۔

کھولیں وہ یا نہ کھولیں در، اس پر ہو کیوں تری نظر
تُو تو بس اپنا کام کر یعنی صدا لگائے جا

کبھی کبھی اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ دعا دیر سے قبول کی جائے اور ہماری بہتری بھی اسی میں ہوتی ہے، لیکن ہم اپنی نادانی کی وجہ سے اس کو نہیں جانتے، اس لیے جلد بازی کرتے ہیں اور مایوس ہو کر دعا چھوڑ دیتے ہیں۔

دعا کے قبول ہونے کی تین صورتیں ہوتی ہیں:

(1) ہم جس چیز کی دعا کرتے ہیں وہی چیز مل جاتی ہے۔

(2) اللہ تعالیٰ ہمیں وہ چیز دینا بہتر نہیں سمجھتے اس لیے وہ تو نہیں ملتی، لیکن اس کے بجائے کوئی اور نعمت دے دیتے ہیں یا کوئی آنے والی بلا اور مصیبت ٹال دیتے ہیں یا اس دعا کو ہمارے گناہوں کا کفارہ بنا دیتے ہیں۔ ہم اس راز سے بے خبر ہوتے ہیں۔

(3) اللہ تعالیٰ ہماری دعا کو آخرت کے لیے ذخیرہ بنا دیتے ہیں۔ یعنی ہم جس مقصد کے لیے دعا کرتے ہیں وہ تو اس دُنیا میں پورا نہیں ہوتا، لیکن اس کے بدلہ میں آخرت کا بہت بڑا ثواب لکھ دیا جاتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ''بعض لوگ جن کی بہت سی دعائیں دُنیا میں قبول نہیں ہوئی ہوں گی، جب آخرت میں پہنچ کر اپنی ان دعاؤں کے بدلے میں ملے ہوئے ثواب اور نعمتوں کے ذخیرے دیکھیں گے تو حسرت سے کہیں گے کہ: کاش! دُنیا میں ہماری کوئی دعا بھی قبول نہ ہوئی ہوتی اور سب کا بدلہ ہمیں یہیں ملتا۔''

(مستدرک حاکم، کتاب الدعاء 1819)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''دعا عبادت کا مغز ہے۔''

(ترمذی، ابواب الدعوات:3371)

اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا وہ عمل ہے جس سے ایک طرف ہماری حاجتیں پوری ہوتی ہیں اور دوسری طرف وہ بذاتِ خود ایک عظیم عبادت بھی ہے، بلکہ عبادت کا مغز ہے جس پر اجر و ثواب ملتا ہے۔ جب اجر و ثواب ملنا یقینی ہے تو پھر کوئی دعا کسی صورت میں رائیگاں نہیں جاتی۔ البتہ دعا مانگنے میں اس بات کا خیال رہے کہ کسی بُرے اور ناجائز کام کے لیے دعا نہ کرے کیوں کہ یہ عبادت نہ رہے گی، گناہ بن جائے گا۔ اسی طرح قطع رحمی کی دعا بھی نہ کرے۔ اپنے عزیز و اقارب سے اچھے تعلقات رکھنے اور حسن سلوک سے پیش آنے کو ''صلہ رحمی'' اور ان سے تعلقات بگاڑنے اور بدسلوکی سے پیش آنے کو ''قطع رحمی'' کہتے ہیں، جو کہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے۔

پیارے بچو! عاجزی، توجہ اور یقین ...... کے ساتھ کی جانے والی دعا کے قبول ہونے کی زیادہ اُمید ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو دعا میں ضرور اختیار کیجیے۔ ☆☆☆

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا لقب صدیقہ تھا، خطاب اُم المومنین، کنیت اُم عبداللہ اور لقب حمیرا تھا۔ آپؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحب زادی تھیں۔ والدہ کا نام اُم رُمان تھا۔ رسول اکرمؐ کی پہلی بیوی حضرت خدیجہؓ تھیں۔ ان کی رحلت کے بعد آپؐ کی شادی حضرت عائشہؓ سے ہوئی۔ حضرت عائشہؓ کا نکاح، مہر، رخصتی غرض ہر رسم سادگی سے ادا کی گئی جس میں تکلف، آرائش اور اسراف کا نام تک نہیں تھا۔ آپؓ کے نکاح کی تقریب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کے ذریعے عرب کی بہت سی بے ہودہ اور لغو رسموں کی بندشیں ٹوٹیں۔ سب سے پہلے یہ کہ عرب منہ بولے بھائی کی لڑکی سے شادی نہیں کرتے تھے، دوسری رسم یہ تھی کہ اہل عرب شوال میں شادی نہیں کرتے تھے۔ عرب ماہِ شوال کو منحوس سمجھتے تھے۔ عرب میں قدیم دستور تھا کہ دلہن کے آگے آگے آگ جلاتے تھے۔ ان تمام رسومات کا خاتمہ بھی ہوا۔

حضرت عائشہؓ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھیں جن کے کانوں نے کبھی کفر و شرک کی آوازیں نہیں سنیں۔ خود حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے اپنے والدین کو پہچانا، ان کو مسلمان پایا۔ آنحضرتؐ کو حضرت عائشہؓ سے نہایت محبت تھی۔ حضرت عائشہؓ کی فضیلت کے بارے میں آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے:

''عورتوں پر عائشہ کی فضیلت ایسی ہے جیسی تمام کھانوں پر ثرید کو فضیلت حاصل ہے۔''

حضرت بی بی عائشہؓ بہت خدمت گزار تھیں۔ شوہر کی نہایت اطاعت گزار تھیں۔ آپؐ اور حضرت عائشہؓ اکٹھے کھانا کھایا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا آنحضرتؐ کی دوسری ازواج سے برتاؤ بہت اچھا تھا۔

حضرت عائشہؓ کی علمی حیثیت کو نہ صرف عام عورتوں پر، نہ صرف اُمہات المومنینؓ پر، نہ صرف خاص خاص صحابیوںؓ پر بلکہ چند بزرگوں کو چھوڑ کر تمام صحابہؓ پر فوقیت حاصل تھی۔ آپؓ سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ صاحبِ علم اور عوام میں سب سے زیادہ اچھی رائے رکھنے والی تھیں۔ بڑے بڑے صحابہؓ ان سے مسائل پوچھا کرتے تھے۔ قرآن، فرائض، حلال و حرام، فقہ، شاعری، طب، عرب کی تاریخ اور نسب کا حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر عالم کسی کو نہ دیکھا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ نے بچپن سے جوانی تک کا زمانہ اس ذات اقدسؐ کی صحبت میں بسر کیا، جو دُنیا میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے آئے تھے اور جس کی روئے جمال کا غازہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم ہے۔ اس تربیت گاہ روحانی یعنی کاشانۂ نبوت نے پرو گیان حرم کو حسنِ اخلاق کے اس رتبہ تک پہنچا دیا تھا، جو انسانیت کی روحانی ترقی کی آخری منزل ہے۔

چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا اخلاق نہایت بلند تھا، وہ نہایت سنجیدہ، فیاض، قانع، عبادت گزار اور رحم دل تھیں۔

انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی عسرت اور فقر و فاقہ سے بسر کی لیکن وہ کبھی شکایت کا کوئی حرف زبان پر نہیں لائیں۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ایک دفعہ انہوں نے کھانا طلب کیا، پھر فرمایا میں کبھی سیر ہو کر نہیں کھاتی کہ مجھے رونا نہ آتا ہو، ان کے ایک شاگرد نے پوچھا: یہ کیوں؟ فرمایا، مجھے وہ حالت یاد آتی ہے جس میں آنحضرتؐ نے دُنیا کو چھوڑا، خدا کی قسم دن میں دو دفعہ کبھی سیر ہو کر آپؐ نے روٹی اور گوشت نہیں کھایا۔ (ترمذی، زہد)

رسولؐ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری اور آپؐ کی مسرت و رضا کے حصول میں شب و روز کوشاں رہتیں، وہ کبھی کسی کی بُرائی نہیں

کرتی تھیں۔ سوکنوں کو بُرا کہنا عورتوں کی خصوصیت ہے مگر وہ کشادہ پیشانی سے اپنی سوکنوں کی خوبیوں کو بیان اور ان کے فضائل ومناقب کا ذکر کرتی ہیں۔

کسی کا احسان کم قبول کرتی تھیں اور کرتی بھی تھیں تو اس کا معاوضہ ضرور ادا کرتی تھیں۔ فتوحاتِ عراق کے مالِ غنیمت میں موتیوں کی ایک ڈبیہ آئی۔ عام مسلمانوں کی اجازت سے حضرت عمرؓ نے وہ حضرت عائشہؓ کو نذر بھیجی۔ حضرت عائشہؓ نے ڈبیہ کھول کر کہا: "خدایا! مجھے ابنِ خطاب کا احسان اُٹھانے کے لیے اب زندہ نہ رکھ۔" اطراف ملک سے ان کے پاس ہدیے اور تحفے آیا کرتے تھے، حکم تھا کہ ہر تحفے کا معاوضہ ضرور بھیجا جائے۔ عبداللہ بن عامر عرب کے ایک رئیس نے کچھ روپے اور کپڑے بھیجے۔ ان کو یہ کہہ کر واپس کر دینا چاہا کہ ہم کسی کی کوئی چیز قبول نہیں کرتے لیکن پھر آپ کا ایک فرمان یاد آ گیا تو واپس لے لیا۔

اپنے منہ سے اپنی تعریف پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس عجز و خاکساری کے باوجود وہ خوددار بھی تھیں۔ حضرت صدیقہؓ کمالِ خودداری کے ساتھ انصاف پسند بھی تھیں۔

نہایت شجاع اور پُر دل تھیں۔ میدانِ جنگ میں آ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں میں اضطراب برپا تھا، اپنی پیٹھ پر مشک لاد لاد کر زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ غزوۂ خندق میں جب چاروں طرف سے مشرکین محاصرہ کیے ہوئے تھے اور شہر کے اندر یہودیوں کے حملے کا خوف تھا، وہ بے خطر قلعہ سے نکل کر مسلمانوں کا نقشۂ جنگ کا معائنہ کرتی تھیں۔ آنحضرتؐ سے لڑائیوں میں بھی شرکت کی اجازت چاہی تھی لیکن نہ ملی۔ جنگِ جمل میں وہ جس شان سے فوجوں کو لائیں، وہ بھی ان کی طبعی شجاعت کا ثبوت ہے۔

حضرت عائشہؓ کے اخلاق کا سب سے ممتاز جوہر ان کی طبعی فیاضی اور کشادہ دستی تھی۔ دونوں بہنیں حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ، نہایت کریم النفس اور فیاض تھیں۔ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کہتے ہیں کہ ان دونوں سے زیادہ سخی اور صاحب کرم میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ فرق یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ ذرا ذرا جوڑ کر جمع کرتی تھیں۔ جب کچھ رقم اکٹھی ہو جاتی تھی، بانٹ دیتی تھیں اور حضرت اسماءؓ کا یہ حال تھا کہ جو کچھ پاتی تھیں، اس کو اُٹھا نہیں رکھتی تھیں، اکثر مقروض رہتی تھیں اور اِدھر اُدھر سے قرض لیا کرتی تھیں۔ لوگ عرض کرنے لگے کہ آپ کو قرض کی کیا ضرورت ہے، فرماتیں کہ جس کی قرض ادا کرنے کی نیت ہوتی ہے، خدا اس کی اعانت فرماتا ہے، میں اس کی اسی اعانت کو ڈھونڈتی ہوں۔

خیرات میں تھوڑے بہت کا لحاظ نہ کرتیں، جو موجود ہوتا سائل کی نذر کر دیتیں۔ ایک دفعہ روزے سے تھیں، گھر میں ایک روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اتنے میں ایک سائلہ نے آواز دی۔ لونڈی کو حکم دیا کہ وہ ایک روٹی بھی اس کی نذر کر دو۔ عرض کی کہ شام کو افطار کس چیز سے کیجئے گا۔ فرمایا، یہ تو دے دو، شام ہوئی تو کسی نے بکری کا سالن ہدیۃً بھیجا، لونڈی سے کہا دیکھو! یہ تمہاری روٹی سے بہتر چیز خدا نے بھیج دی۔ اپنے رہنے کا مکان امیر معاویہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا، قیمت جو آئی وہ سب راہِ خدا میں صرف کر دی۔

دل میں خوف اور خشیتِ الٰہی تھی۔ رقیق القلب بھی بہت تھیں، بہت جلد رونے لگتیں تھیں۔ عباداتِ الٰہی میں اکثر مصروف رہتیں، چاشت کی نماز پڑھا کرتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ اگر میرا باپ بھی قبر سے اُٹھ کر آئے اور مجھ کو منع کرے تو میں باز نہ آؤں۔ آنحضرتؐ کے ساتھ راتوں کو اُٹھ کر نمازِ تہجد ادا کرتی تھیں۔ آپؐ کی وفات کے بعد بھی اس قدر پابند تھیں کہ اگر اتفاق سے آنکھ لگ جاتی اور وقت پر اُٹھ سکتیں تو سویرے اُٹھ کر نمازِ فجر سے پہلے تہجد ادا کر لیتیں۔ ایک دفعہ اسی موقع پر ان کے بھتیجے قاسم پہنچ گئے تو انہوں نے دریافت کیا کہ پھوپھی جان یہ کیسی نماز ہے؟ فرمایا، میں رات کو نہیں پڑھ سکی اور اب اس کو چھوڑ نہیں سکتیں ہوں۔ رمضان میں تراویح کا خاص اہتمام کرتی تھیں۔ ذکوان نام کا ایک خواندہ غلام تھا جو امام ہوتا تھا۔ سامنے قرآن رکھ کر پڑھتا تھا، یہ مقتدی ہوتیں۔

اکثر روزے رکھا کرتی تھیں اور بعض روایتوں میں ہے کہ ہمیشہ روزے سے رہتی تھیں۔ ایک دفعہ گرمی کے دنوں میں عرفہ کے روز روزے سے تھیں۔ گرمی اور تپش اس قدر شدید تھی کہ سر پر پانی کے چھینٹے دیئے جاتے تھے۔ عبدالرحمٰن آپ کے بھائی نے کہا کہ اس گرمی میں روزہ ضروری نہیں، افطار کر لیجئے۔ فرمایا کہ جب میں آنحضرتؐ کی زبانی یہ سن چکی ہوں کہ عرفہ کے دن روزہ رکھنا سال کے گناہ معاف کرا دیتا ہے تو میں روزہ توڑوں گی؟

(بقیہ: صفحہ 59 پر ملاحظہ کریں۔)

محمد فاروق دانش

ایک انڈا ایک نوالہ

گرمی کا موسم اپنی شدت پر تھا۔ وہ لوگ تو مزے میں سو رہے تھے جن کے پاس جنریٹر یا یو پی ایس تھے لیکن معمولی روزی کمانے والے مزدور پیشہ لوگوں کے پاس ایسی سہولیات کہاں......؟ ان مزدور طبقے کا معمول یہ ہوتا ہے کہ وہ شدید گرمی میں اپنے بند کمروں سے نکل کر گھروں کی چھتوں پر جا کر سو جاتے ہیں اور ہوا کے جھونکوں کے منتظر رہتے ہیں اور مزدوری کے لیے صبح سویرے ہی نکل جاتے ہیں۔

نعمان کا روزگار تو بہتر نہ تھا، پھر بھی اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنے بیٹے کو ایک اچھے اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ نعمان لوہے کی بنی ریڑھی پر لوگوں کا سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا کر اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرتا تھا لیکن اس کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا، باپ کی طرح مزدوری نہ کرے بلکہ کوئی اچھا پیشہ اپنا کر یا اچھی ملازمت حاصل کر کے اپنا مستقبل سنوار سکے۔ وہ روز سویرے اُٹھ کر اپنے لاڈلے کو اسکول چھوڑنے جاتا تھا۔ اس کا کام تو بازار کھلنے کے وقت یعنی کوئی دوپہر بارہ بجے شروع ہوتا تھا لیکن اپنے بیٹے کی خاطر وہ سویرے اُٹھ بھی جاتا اور اسے اسکول چھوڑ کر کسی نہ کسی کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔

آج ہفتے کا دن تھا، لہٰذا اس کے بیٹے سلمان کو اسکول سے چھٹی تھی۔ اس لیے اس کا ارادہ دیر تک سونے کا تھا مگر رات اسے پتا چلا کہ اس کا بھائی ٹائی فائیڈ بخار کا شکار ہو گیا ہے، اس لیے اسے دیکھنے جانا ضروری تھا۔ ان دو دنوں میں وہ عدنان کو دیکھ کر آ سکتا تھا۔ عدنان اپنی والدہ کے ساتھ نصرپور، اپنے آبائی گھر میں رہتا تھا۔ اس کے علاقے سے اپنے گھر کا سفر تین گھنٹے کا تھا، اس لیے اس نے سویرے سویرے ہی نکل جانا مناسب سمجھا کہ بعد میں گرمی کو کون جھیلے گا۔

بس دو گھنٹے بعد ایک بڑے اسٹاپ پر ٹھہری تو مسافروں کو بتایا گیا کہ ایک ٹائر میں چوں کہ خرابی ہے اس لیے اسے تبدیل کرنا پڑے گا۔ بس ویسے بھی اس اسٹاپ پر بیس منٹ کا وقفہ کرتی تھی تاکہ پُرانے مسافر اُتر جائیں اور آگے کی منزل کی طرف جانے والے اس میں شریک ہو جائیں۔

مسافروں کو ایک گھنٹے کے بعد بس میں سوار ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔ نعمان نے سوچا کہ کیوں نہ شہر کے اندر تھوڑا سا گھوم پھر لیا جائے۔ بس دس بجے سے پہلے روانہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بسم اللہ پڑھ کر شہر کی اندرونی جانب بڑھ

گیا۔ بڑے شہروں کی نسبت چھوٹے شہروں بازار کی چہل پہل پہلے شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں بازار کھلنا شروع ہو چکے تھے۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ایک ہمارا شہر ہے کہ بارہ بجے بھی دُکان دار مر مر کر آنکھیں ملتے ہوئے دُکان کی طرف آ رہے ہوتے ہیں اور راتوں کو تو ان کا دل ہی نہیں چاہتا کہ گھر کی جانب واپس ہو جائیں۔ وہ اردگرد کسی ہوٹل کی تلاش میں تھا تاکہ ناشتا کر لے۔ سویرے تو وہ صرف چائے پی کر ہی چل دیا تھا۔

ابھی وہ اس سوچ میں ہی تھا کہ کس طرف جا کر ہوٹل تلاش کرے کہ ایک دیہاتی نے اس کی جانب بڑھ کر اس سے سلام دُعا کر لی۔

''لگتا ہے اس شہر میں نئے ہو؟''

''جی!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ فوراً پوچھ بیٹھا۔

''انڈا اور پراٹھا کھاؤ گے۔''

نیکی اور پوچھ پوچھ۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، اس لیے کچھ تذبذب کے بعد وہ اس دیہاتی کے ساتھ چل دیا۔ وہ اسے بازار کے ایک طرف سے نکال کر ایک سادہ سی سڑک کی طرف لے کر چلا۔ یہ راستہ شاید آبادی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ وہ شخص اسے کسی ہوٹل میں لے کر جائے گا لیکن وہ تو اسے لے کر شاید اپنے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اس نے خوامخواہ سوالات میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس کے ساتھ چلنے کو زیادہ اہمیت دی۔ وہ تو انڈے اور پراٹھے کا دل دادہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک ایسے مکان کے سامنے کھڑے تھے جس کے دروازے پر ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ کوئی پچاس ساٹھ افراد اس لائن میں کھڑے کسی چیز کے لیے مچل رہے تھے۔ اس شخص نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس قطار کی جانب بڑھا اور اسے بھی اپنے ساتھ کھڑا کر لیا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

''ارے بابا! سب سمجھ جاؤ گے۔'' اس کے بعد اس نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا اور قطار میں آگے بڑھتا رہا۔ دس منٹ کے اندر اندر ان کا نمبر بھی آ گیا۔ اس کا ہاتھ جب کھڑکی میں گیا تو اندر سے ایک ٹوکن دے دیا گیا۔ اس نے دیکھا تو اس پر ایک انڈا، ایک پراٹھا تحریر تھا۔ ان کے پیچھے بھی خاصی تعداد میں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ٹوکن پا کر وہ دوسروں کی طرح خوشی خوشی اندر داخل ہو چکے تھے۔ جب وہ اندرونی طرف پہنچے تو وہاں ایک بڑا صحن تھا جس میں دریاں اور دسترخوان بچھایا ہوا تھا۔ ان سے پہلے اندر آنے والے لوگ اپنے لیے جگہ پسند کر کے بیٹھ چکے تھے۔ ان دونوں نے بھی اپنے لیے جگہ پسند کی اور بیٹھ گئے۔ انہیں کتنا انتظار کرنا ہوگا؟ اس نے سوالیہ نظروں سے جب اس اجنبی ہم درد کی جانب دیکھا تو وہ اس کی پریشانی کو بھانپ کر خود ہی بولا۔

''ہمارے ٹوکن کا نمبر 65 ہے۔ جیسے ہی 101 واں ٹوکن دے دیا جائے گا، کھڑکی بند ہو جائے گی اور تمام لوگوں کے دسترخوان پر بیٹھتے ہی ناشتا تقسیم ہونا شروع ہو جائے گا۔''

نعمان کے پاس آدھا گھنٹا باقی تھا، پھر بھی تشویش تو رہتی ہے۔ اس نے اڈے سے چلتے ہوئے اپنی ساتھ والی سیٹ کے ساتھی کو اپنا موبائل نمبر لکھوا کر یہ تاکید کر آیا تھا کہ ٹائر کی تبدیلی کے بعد جیسے ہی بس چلنے کو ہو تو مس کال دے دے اور بس والوں کو بھی بتائے کہ میرا انتظار کریں۔

چند ہی ساعتوں میں ویسا ہی ہوا۔ ہر فرد کے آگے ایک سیلوفین کاغذ میں لپٹا انڈا پراٹھا آنا شروع ہو گیا۔ انہوں نے سیکنڈوں میں پورے ایک سو ایک افراد کو خوش بو دار دیسی گھی میں تلا ہوا انڈا، پراٹھا دے دیا اور اب سب کو اشارہ ہوا کہ کھانا شروع کر دیا جائے۔ جوں جوں ان کا ناشتا آگے بڑھ رہا تھا، چائے کے کپ کھنکے اور سب کے آگے ایک ایک کپ بھی رکھ دیا گیا۔ تمام لوگوں نے مزے لے کر انڈا پراٹھا کھایا اور ساتھ میں چائے کی چسکیاں لینا شروع کر دیں۔ وہ بے حد حیران تھا کہ یہ نہ تو ہوٹل ہے نہ کوئی درگاہ۔ پھر اس قدر اہتمام کیوں؟

جب وہ کھا پی کر باہر نکلے اور میزبانوں نے بجائے ان سے کچھ لینے کے ان کا شکریہ ادا کیا اور آئندہ بھی آنے کی دعوت دی۔ بیرونی دروازے پر اب اس محفل کا انعقاد کرنے والا فراخ دل انسان بھی موجود تھا جو باہر جانے والے ہر فرد سے خوش دلی سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ وہ بھی یہی ظاہر کر رہا تھا کہ آئندہ بھی آ کر اس دعوت کو رونق بخشیں۔

وہ دل ہی دل میں بے حد خوش ہوا اور اس سیٹھ کے لیے اس

کے دل سے بھی دعا نکلی۔ آج کے دور میں کوئی کسی کو بغیر مطلب کے کھانا نہیں کھلاتا، یہ شخص روزانہ ایک سو ایک افراد کو خوش دلی سے ناشتا کرا رہا ہے۔ اس نے اپنے اجنبی دوست کو بس کے اڈے تک چلنے کی دعوت دی جو اس نے بخوشی قبول کر لی۔

وہ اس عجیب وغریب دعوت پر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی حقیقت جاننے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ دیہاتی چوں کہ اسی علاقے کا تھا اس لیے اسے کہانی ضرور معلوم ہو گی۔ اس نے اجنبی سے یہی سوال کیا تو وہ ایسے شروع ہو گیا جیسے خود اس کو بتانے کی فکر میں ہو۔

"بات یہ ہے ادا (بھائی)! ابھی جس رئیس کی انڈے پراٹھے کی دعوت کھا کر ہم آ رہے ہیں، اصل میں اس کے ساتھ بڑا عجیب وغریب واقعہ ہوا تھا جس نے اس کی زندگی یکسر بدل دی اور اب وہ کئی برسوں سے روزانہ سو سے اوپر افراد کو ناشتا کراتا ہے، پھر اس کے بعد اپنے گھر والوں کے ساتھ جا کر کھاتا ہے۔ ہے ناں یہ اس کی اعلیٰ ظرفی۔"

"کیوں نہیں!" اتنی اچھی بات کو سن کر اس نے اس کی تائید کی۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنی بات شروع کی۔ "ایک وقت ایسا تھا کہ وہ ایک عام سا آدمی تھا، یوں سمجھو ہماری تمہاری طرح کا انسان۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ سانس لی اس کے بعد پھر شروع ہو گیا۔

"معمولی سی ملازمت تھی۔ اس کے گھر کے حالات زیادہ اچھے نہ تھے، پھر بھی یہ خود روزانہ انڈے سے ہی ناشتا کرتا تھا۔ اس کا صرف ایک بیٹا تھا جو اس کے ناشتے کے دوران سامنے آ جاتا تھا۔ رئیس چاہتا تھا کہ وہ خود ہی پورا انڈا کھائے، اس میں کسی کو بھی شریک نہ کرے۔"

"پھر کیا ہوا؟" اس نے سوال کیا۔

"جب بیٹا اس کی طرف بڑھ جاتا یا اس کے انڈے کی طرف نگاہ کر لیتا تو وہ سخت غصہ ہو جاتا اور کبھی کبھی اس کو ہاتھ بھی جڑ دیتا۔" اجنبی نے کہا۔

"اوہ! یہ تو بہت بُرا ہوتا تھا۔"

"بس! غربت انسان کی عقل بھی ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ بعد میں وہ پیٹھ موڑ کر ناشتا کرنے لگتا اور اُٹھنے سے پہلے بیٹے کے لیے انڈے اور پراٹھے کا ایک نوالہ چھوڑتا۔" دیہاتی نے کہا۔

"اُف! اس کے بیٹے کے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔" اس نے اداسی سے سوچا اور اچانک ہی اس کے ذہن میں کچھ خیالات کوندنے لگے۔

"پھر یہ ہوا کہ اس کی بخیلی کی اسے سزا ملی۔ اس کا یہی اکلوتا بیٹا باپ کی باتیں سوچ سوچ کر نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گیا۔ بہکی بہکی باتیں کرتے کرتے وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اب کہاں کے انڈے اور کہاں کے پراٹھے۔ بیٹے کی بیماری نے اس کو سب کچھ بھلا دیا۔ وہ اس کے علاج کے لیے مارا مارا پھرتا رہا۔ پریشانی تھی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔"

"اوہ!" اس نے افسردگی سے کہا۔ اس عرصے میں وہ بس اڈے کی طرف پہنچ چکے تھے۔ ٹائر لگا دیا گیا تھا اور مسافر بس میں

سوار ہو رہے تھے۔

''ایک بزرگ نے جب رئیس کو پریشانی میں دیکھا تو یہ مشورہ دیا کہ تم صدقہ دو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری ہر مشکل آسان کرے گا۔ رئیس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ اس نے صدقے کو معمول بنایا اور اپنی پسند کی چیز یعنی انڈا اور پراٹھا بنواتا اور غریبوں کو کھلا کر آتا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کا بیٹا معمول پر آنا شروع ہو گیا۔ اب وہ بیٹے کو پہلے کھلاتا، بعد میں خود کھاتا۔''

''واہ! یہ تو زبردست کام ہوا۔'' اس کے ذہن میں ایک خیال آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔

''اس صدقے کی بدولت اللہ نے اس کے کام میں ایسی برکت دی کہ اس کے پاس گویا دولت برسنے لگی۔ اس کے پاس ایک بنجر زمین تھی، اس سے فصل اُگنے لگی۔ وہ راتوں رات امیر ہو گیا۔ شکرانِ نعمت کے طور پر اب یہ اس کا معمول ہے کہ پہلے ایک سو ایک لوگوں کو روزانہ کھانا کھلاتا ہے، پھر خود کھاتا ہے۔''

اپنی کہانی ختم کر کے دیہاتی نے سلام دعا کے بعد اس سے اجازت طلب کی اور روانہ ہو گیا۔ وہ بھی جلدی سے بس میں سوار ہو گیا۔ اب وہ مستقل سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی خیریت دریافت کر کے جلد از جلد گھر جانا چاہتا تھا۔ آج کے ناشتے نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ خود بھی ایک ایسی ہی کوتاہی کا مرتکب ہو رہا تھا جیسی رئیس سے سرزد ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ انڈا پراٹھا کھاتا ہے تو اس کی ننھی کومل اس کے پاس آ بیٹھتی ہے اور وہ اس سے نظریں چرا کر یا ایک آدھ نوالہ کھلا کر اسے اِدھر اُدھر ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ اپنے بیٹے کے تو پھر بھی وہ ناز اُٹھالیتا ہے لیکن بیٹی کو بالکل بھی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔

''آہ میری کومل! میری بیٹی پر بھی تو میرا حق ہے۔ اگر مجھے تقدیر نے آزما لیا تو.....'' اس بات کے تصور نے اس کو احساسِ ندامت میں مبتلا کر دیا۔

اپنے بھائی کی خیریت دریافت کر کے جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں انڈے، پراٹھے، حلوہ پوری اور مکھن تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنی کومل کو آواز دی۔ اسے گود میں بٹھایا، بہت سا پیار کیا اور پھر فوری دسترخوان لگوا کر سب کو بٹھا لیا۔ اپنی بیٹی کے منہ میں جب اس نے اپنے ہاتھوں سے نوالے ڈالے تو اس کی خوشی دیکھ کر اس کا سیروں خون بڑھ گیا۔ اسے اُمید ہو چلی تھی کہ اس کا مہربان رب اپنے گھر والوں سے حسنِ سلوک کے صلے میں اس پر ضرور مہربان ہو گا۔

☆☆☆

جوگی

جوگی بابا بین بجائے
سانپوں کا اک جوڑا لائے
کانوں میں اک بالا پہنے
کوچہ کوچہ آئے جائے

بین کی میٹھی میٹھی دھن
سانپوں کی ازلی دشمن
جوگی کھیل تماشے کر کے
پیسے مانگے ہر آنگن

بچے گھر سے بھاگے آئیں
پیسے لائیں آٹا لائیں
جوگی آیا جوگی آیا
کہتے کہتے شور مچائیں

جوگی کا ہے نیارا دھن
اک ناگ اور اک ناگن
دونوں لپٹے لپٹے جائیں
بچوں کا بہلائیں من

بھوکا جوگی کھانا کھائے
بچہ بھاگے پانی لائے
پھنیر آپ تماشا کر کے
دودھ پیئے اور پھن لہرائے

محنت کر کے روٹی کھاؤ
نہ بھاؤ نہ کوئی تاؤ
اپنے منہ کی روٹی دے کر
کیا کرو اچھا برتاؤ

جیسے اللہ جوگی پالے
جو بھی روکھی سوکھی کھا لے
ناگوں کو جھولی میں رکھ کر
نعرے مارے اللہ والے

(احمد عدنان طارق)

داؤدی علمی آزمائش

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کن الفاظ میں پکارا جاتا ہے؟

i۔ ترجمان القرآن ii۔ رفیق الغار iii۔ سید المسلمین

2۔ کس مسجد میں حضور اکرم ﷺ کو قبلہ تبدیل کرنے کا حکم ہوا؟

i۔ مسجد نبویؐ ii۔ مسجد ذوقبلتین iii۔ مسجد قباء

3۔ "مُردوں کا شہر" پاکستان کے کس شہر کو کہا جاتا ہے؟

i۔ ٹھٹھہ ii۔ ٹیکسلا iii۔ موہن جودڑو

4۔ یہ شعر بانگ درا سے لیا گیا ہے۔ دوسرا مصرع بتایئے:

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں ....

5۔ سول سیکرٹریٹ پر مسلم لیگ کا جھنڈا پہلی مرتبہ کس خاتون نے لہرایا؟

i۔ شائستہ اکرام اللہ ii۔ رعنا لیاقت علی iii۔ فاطمہ صغریٰ

6۔ برطانوی پولیس کو کیا کہتے ہیں؟

i۔ رائل پولیس ii۔ پولیس آف برطانیہ iii۔ بوبی

7۔ "علم دار" کن کا لقب ہے؟

i۔ حضرت حسینؓ ii۔ حضرت عباسؓ iii۔ حضرت علیؓ

8۔ کس شخصیت کو قائداعظم کانگریس کا "شو بوائے" کہا کرتے تھے؟

i۔ گاندھی ii۔ ابوالکلام آزاد iii۔ نہرو

9۔ کرکٹ کی اصطلاح میں جو کھلاڑی پہلی گیند پر آؤٹ ہو جائے کیا کہلاتا ہے؟

i۔ بیٹ کیری ii۔ گولڈن ڈک iii۔ رنر

10۔ پاکستان کی دستوری کتاب کا رنگ کیا ہے؟

i۔ سرخ ii۔ سبز iii۔ سفید

جوابات علمی آزمائش ستمبر 2015ء

1- ایلیا 2- عامر بن ربیعہ 3- چھ تارے 4- ارشمیدس 5- سفید گھر 6- 1920ء 7- نماز عید کے لیے جاتے ہوئے عاریا تخمی 8- ایران 9- حنیفہ تھا 10- کتب

پاس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ علیم اسحاق، جہلم (150 روپے کی کتب)

☆ انیقہ فجر ظفر قریشی، میرپور (100 روپے کی کتب)

☆ ریان وارث، سیالکوٹ (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی:

علینا اختر، کراچی۔ احمد عبداللہ، ملتان۔ ابدال شفقت، اکوڑہ خٹک۔ خدیجہ شجاعت، لاہور۔ محمد ارحم عمران، ملتان۔ محمد قمر الزماں صائم، مٹھہ ٹوانہ۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ حارث نعیم، لاہور۔ مامون شفقت، اکوڑہ خٹک۔ محمد طیب طاہر، چونگی۔ مطیع الرحمن، ثمن رؤف، لاہور۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ سلطان سرفراز، ملتان۔ عائشہ ذوالفقار، لاہور۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ نائمہ خالد، لاہور۔ تحریم یونس، بہاول نگر۔ طلحہ محمود، لاہور۔ مائرہ اشرف، جوکالیاں۔ عدن سجاد، جھنگ۔ محمد سجاد برلی، پشاور۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ حضرت امین، پشاور۔ شماس جاوید، پھول نگر۔ رامین رضوان، راول پنڈی۔ ماہین شاہد، گجرات۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ سارہ خالد ڈوگر، عزت مسعود، فیصل آباد۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ نجم السحر، ملک وال۔ محمد عمر نعیم، جھنگ صدر۔ فائزہ شریف، پشاور۔ حسیب ناصر، لاہور۔ مہروز محمود، جہلم۔ ابوبکر، کوٹ چھٹہ۔ مدیحہ، خانیوال۔ امتیاز الحسن، گوجرانوالہ۔ عاصم غفور، بہاول پور۔ محمد نوید، قصور۔ شجاعت علی، راول پنڈی۔ ذوالفقار حیدر، لاہور۔ محمد الیاس، سبین بیگ، لاہور۔ یسریٰ زینب اختر، کراچی۔ سدرہ حنیف، فیصل آباد۔ عاصم محمود، لاہور۔ طارق محمود، اوکاڑہ۔ نزہت، ڈیرہ اسماعیل خان۔ صابرہ رحمٰن، مہوش ایوب، لاہور۔ ثوبیہ علی، فیصل آباد۔ تقی حیدر، کراچی۔ محمد طاہر، سرگودھا۔ ثوبیہ عارف، بورے والا۔ نعمان احمد، لاہور۔ فاخرہ خاتون، طاہرہ یعقوب، عمران ایوب، لاہور۔ الیاس احمد، وہاڑی۔ تکرم علی، میرپور۔ سید ذیشان حیدر، وہاڑی۔ امینہ گل، عبدالرافع، وقار نعیم، عبدالوہاب، فضل کریم، صادق آباد۔ ملک توصیف، فیصل آباد۔ محمد ضیاء اللہ، محمد شاہد، مریدکے۔ ثناء طفیل، سیالکوٹ۔ محمد اورنگ زیب، عرفان، لاہور۔ زاہد مظہر، ثوبیہ، شاہ کوٹ۔ کاشف اقبال، سرگودھا۔ مہرالنساء، ڈیرہ اسماعیل خاں۔ عبدالجبار، کراچی۔ صالحہ ناز، ملتان۔ زین علی، شاہ کوٹ۔ عدنان فیصل، راول پنڈی۔ شمع نسرین، لاہور۔ کاشف ضیاء، اسلام آباد۔ نعمان جاوید، فیصل آباد۔ ارسلان اسلم، کوہاٹ۔

وہ قدموں کے نشانات کے ساتھ ساتھ چلتے کافی دور نکل گئے۔ آخر پُراسرار نشان ایک گدلے جوہڑ کے کنارے پہنچ کر غائب ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔

واپس جاتے ہوئے عامر کہنے لگا: ''خدا جانے وہ رات کو کس ارادے سے آیا تھا؟'' ''دوبارہ جنگل میں آگ لگانا چاہتا ہو گا، مگر بارش کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔'' عمار نے کہا۔ انہوں نے بنگلے کے صدر دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ دروازے کے عین وسط میں کوئی چیز پڑی دکھائی دی۔ یہ پتھر میں لپٹا ہوا ایک کاغذ تھا۔ اس میں لکھا تھا: ''زیدی بھائیو! اب بھی مان جاؤ۔ یہ آخری تنبیہ ہے۔''

یہ رقعہ بھی عامر نے جیب میں رکھ لیا۔ عمار کہنے لگا: ''جب ہم جنگل کی طرف گئے تھے تو یہ رقعہ اس جگہ موجود نہ تھا۔''

واپس آ کر عامر نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ انسپکٹر نے اسے بتایا کہ رات اس نے پولیس کی ایک بڑی نفری لے کر ہوٹل پر چھاپا مارا لیکن کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔ سب کمرے خالی پڑے تھے۔ پولارڈ کہنے لگا کہ وہ لڑکے جان بوجھ کر پولیس کو تنگ کرنا چاہتے ہوں گے۔

''انہوں نے ہمیں ولیم کے گھر پابند کر کے چوری کے سامان کو ٹھکانے لگا دیا ہو گا۔'' عمار نے کہا۔ کافی دیر بارش نہ تھمی تو وہ مزید انتظار کیے بغیر امجد کے پاس گئے اور اسے رات کے سارے واقعات سنائے۔ اتنے میں امجد کا دوست ٹوگو بھی آ گیا۔ وہ کل سے اپنے اسکول کے ڈرامے کی ریہرسل کے سلسلے میں کسی کلاس فیلو کے ہاں گیا ہوا تھا۔ کھانے کا وقت ہوا تو امجد انہیں قریب کے ایک ہوٹل میں لے گیا اور چاروں نے کھانا کھایا۔ اسی دوران باتیں بھی ہوتی رہیں۔ عامر نے امجد سے تہ خانے کے خفیہ حصے اور اس کے اندر تابوت کے متعلق پوچھا تو امجد نے لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا۔

''ٹوگو، کبھی تمہیں اس تہ خانے میں جانے کا اتفاق ہوا ہے؟'' عمار نے پوچھا۔ ٹوگو نے انکار کرتے ہوئے کہا: ''ممکن ہے یہ تہ خانہ پہلے مالک مکان نے اپنے بزرگوں کے مردے محفوظ رکھنے کے لیے بنایا ہو۔'' عامر نے اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا مگر عمار نے ٹوگو سے پوچھا: ''آگ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا واقعی یہ زومی کا کام ہے؟''

''کہتے تو یہی ہیں۔ اب کیا معلوم۔'' ٹوگو نے جواب دیا اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ گھر واپس آئے تو ٹوگو نے یکایک کچھ یاد کر کے کہا: ''کیا تمہیں جادو پر یقین ہے، عامر؟''

''کیا مطلب؟'' ''یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ایک سبز پہاڑی ہے۔ وہاں ایک غار میں ایک جوگی رہتا ہے۔ وہ غیب کی باتیں بتاتا ہے۔ چاہو تو آگ کے بارے میں اس سے پوچھ لو۔''

اتنا کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور امجد سے بولا: ''اچھا، میں چلتا ہوں۔ مجھے سہ پہر کو پھر ریہرسل کے لیے جانا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی عامر اور عمار بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عامر بولا: ''ٹھیک ہے، جوگی سے بھی مل لیتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔''

کار میں بیٹھتے ہی عمار نے عامر کے کندھے پر جھک کر کہا: ''میرا خیال ہے ٹوگو عجائب خانے کے متعلق جانتا ہے۔''

''خبر نہیں مجھے یہ لڑکا کچھ مانوس سا کیوں لگتا ہے، حالاں کہ ہماری اس سے یہ پہلی ملاقات ہے۔'' عامر نے خیال ظاہر کیا۔

وہ دونوں اسی وقت سبز پہاڑی کی طرف روانہ ہوئے، اور کوئی آدھ گھنٹے بعد پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔ انہوں نے کار کو درختوں کے جھنڈ میں پارک کیا اور غار کی تلاش میں پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ عمار نے ایک درخت پر چڑھ کر دیکھا تو اسے غار کے باہر ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا۔ دونوں اسی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ گھنے جھاڑ جھنکاڑ سے پٹا پڑا تھا۔ وہ خاردار جھاڑیوں میں الجھتے، گرتے پڑتے، پہاڑی پر چڑھ رہے تھے کہ یکا یک اوپر سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ ایک بہت بڑا چٹان کا ٹکڑا اوپر سے لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گئے اور پتھر ان کے درمیان سے گزر کر نیچے زمین پر جا گرا۔

''میرا خیال ہے یہ پتھر ہم پر اسی جوگی نے پھینکا ہے۔'' عمار نے کہا۔

آخرکار وہ چٹان کے اوپر پہنچ ہی گئے۔ جوگی ان کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ آہٹ پا کر بھی متوجہ نہ ہوا اور جب لڑکے اس کے سامنے گئے تو وہ غضب ناک نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر چلّایا: ''کون ہو تم؟ کیوں آئے ہو؟ جاؤ! واپس جاؤ!'' اور پھر اُٹھ کر غار میں چلا گیا۔ لڑکے بھی اس کے پیچھے پیچھے غار میں چلے گئے۔

''بابا، ہم آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔'' عامر نے ادب سے کہا۔

''میں تم دُنیا والوں سے بھاگ کر یہاں آ چھپا ہوں اور تم مجھے یہاں بھی چین سے رہنے نہیں دیتے۔ کیا پوچھتے ہو؟ پوچھو!''

''ہم جنگل کی آگ کے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔'' عمار نے کہا۔

''اچھا، تو آؤ میرے ساتھ۔'' یہ کہہ کر وہ غار سے نکلا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ ایک جگہ پہاڑوں کے درمیان چھپی ہوئی گہری کھائی تھی۔ اس کے کنارے پر گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ان جھاڑیوں سے بچ کر جوں ہی عمار آگے بڑھا، اس کا پاؤں رپٹ گیا۔ اگر عامر نے جھپٹ کر اس کی جیکٹ نہ پکڑ لی ہوتی تو وہ کئی فٹ گہرے کھڈ میں جا گرتا۔ جوگی انہیں لے کر ایک پہاڑی پر کھڑا ہو گیا اور ڈھلان پر پھیلے ہوئے جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: ''یہ دیکھو! جنگل کی آگ کا نظارہ!''

اس کے اشارے پر لڑکوں نے جلی ہوئی جھاڑیوں اور جھلسے ہوئے درختوں کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو شاید بجلی گرنے سے آگ لگی ہوگی۔ ہم اس کے متعلق نہیں، اس آگ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جو سید صاحب کے بنگلے کے پیچھے والے جنگل میں لگی تھی۔''

''یہ میں واپس چل کر بتاؤں گا۔'' یہ کہہ کر جوگی واپس مڑا۔ راستے میں پھر اس نے عامر کو ایک تختے پر سے گرانے کی کوشش کی

جو دو چٹانوں کے درمیان پل کا کام دیتا تھا مگر وہ معجزانہ طور پر بچ گیا۔ غار میں پہنچ کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور جھڑ بیری کے بیر چبانے لگا، جیسے اسے کسی کے وہاں موجود ہونے کا احساس ہی نہ ہو۔

''اب بتاؤ، بابا! تم نے کہا تھا، واپس چل کر بتاؤں گا۔'' عمار نے اسے مخاطب کیا۔

''ہاں...... وہ آگ؟ وہ میں نے لگائی تھی!'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ لڑکے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''تم نے؟ مگر تم تو اس پہاڑی سے اُتر کر کبھی آبادی کی طرف نہیں جاتے۔'' عامر نے کہا۔

''میں نے کب کہا کہ میں وہاں گیا تھا۔'' اس نے بدستور بیر چباتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھی نے میرے حکم سے لگائی تو سمجھو میں نے ہی لگائی۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''تمہارا ساتھی کون ہے؟'' عمار نے پوچھا۔

''زومی۔'' اس نے عیاری سے ان کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''اچھا، زومی۔ اس کا نام کیا ہے؟'' عامر نے پوچھا۔

''یہ تو تم اسی سے پوچھنا۔ اگر ہمت ہے تو۔'' جوگی نے پھر اسی لہجے میں کہا۔ لڑکوں کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر گئے۔

''ہمیں وہ ملے گا کہاں؟'' عامر نے پوچھا۔

''وہاں......'' اس نے غار کے منہ کی طرف اشارہ کیا۔ ایک لمحہ لڑکوں کو یوں لگا جیسے کوئی سایہ سا گھنے درختوں میں نظر آیا مگر غور سے دیکھا تو وہ دھوئیں کے مرغولے تھے جو بہت دُور امجد کے بنگلے کے قریب جنگل سے اُٹھ رہا تھا۔

''ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔'' عامر نے کہا، اور دونوں چھلانگیں مارتے ہوئے پہاڑ پر سے اُتر کر اپنی کار کی طرف دوڑ پڑے۔

''سب سے پہلے ہمیں فائر بریگیڈ کو فون کرنا چاہیے۔'' عمار نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ عامر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، اور اگلے ہی لمحے گاڑی ہوا کے دوش پر اُڑی جا رہی تھی۔ وہ بیس منٹ کے اندر موقعے پر پہنچ گئے مگر پولیس نے سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں اور کسی کو اس علاقے کی طرف جانے کی اجازت نہ تھی مگر جب زیدی بھائیوں نے اپنا تعارف کرایا تو پولیس نے انہیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ بنگلے کے چاروں طرف چکر لگاتے ہوئے جنگل کی طرف والے باغیچے میں گئے۔ آگ کافی پھیل چکی تھی، مگر ابھی بنگلے سے خاصی دُور تھی۔ شعلے لپک لپک کر آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک تناور درخت کا تنا دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ ساتھ والے چھوٹے درختوں پر گرا اور وہ بھی آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔

''خدا کی پناہ! میں نے ایسا بھیانک منظر آج تک نہیں دیکھا۔'' عمار پریشان ہو کر کہنے لگا۔

اتنے میں فائر بریگیڈ کے پانچ انجن آ چکے تھے اور وہ آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ ٹرکوں پر بڑی بڑی مشینیں رکھی ہوئی تھیں جو آگ بجھانے والی گیس پھینک رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ بل ڈوزر جلی ہوئی جھاڑیوں کو صاف کرتے جا رہے تھے۔ جنگل کے اندرونی حصے میں جہاں حالت زیادہ خطرناک تھی، ہیلی کاپٹر سے آگ بجھانے والی کیمیائی اشیا چھڑکی جا رہی تھیں۔ عامر اور عمار نے عملے کے انچارج سے خود لے کر سر پر پہننے اور بیلچے پکڑ کر دوسرے لوگوں کے ساتھ گھاس اور جھاڑیاں صاف کرنے لگے۔ عامر کے ساتھ اسی کی عمر کا ایک لڑکا بھی کام میں مصروف تھا۔ عامر نے غور سے اسے دیکھا تو اس کا ہاتھ رُک گیا۔ وہ امجد کا دوست ٹوگو تھا۔

''پولیس کا ٹیلی فون آیا تو امجد گھر پر نہیں تھا۔ میں اس کے لیے پیغام چھوڑ کر خود چلا آیا۔'' ٹوگو نے عامر کو بتایا۔ عامر نے اس کی مستعدی کی تعریف کی۔ اتنے میں امجد بھی پہنچ گیا اور ان کے ساتھ کام میں شامل ہو گیا۔ آخر سب کی انتھک محنت اور جاں فشانی کے نتیجے میں آگ بجھ گئی۔

عامر نے فائر بریگیڈ کے انچارج سے پوچھا: ''آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''یہ کسی نے دانستہ لگائی ہے۔ ہم نے نزدیک کی جھاڑیوں میں ماچس کی کئی تیلیاں پڑی دیکھی ہیں۔ پہلے اس شخص نے مکان کے قریب کی جھاڑیوں میں آگ لگانی چاہی مگر جب سبز شاخوں نے آگ نہ پکڑی تو وہ جنگل کے درمیانی حصے میں کسی خشک جھاڑی کو جلانے میں کامیاب ہو گیا۔'' افسر نے بیان کیا۔

''ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے۔'' عمار نے جوش سے کہا۔

''پکڑا جائے تو ضرور سزا دی جائے گی۔'' افسر نے عمار کو جواب دیا۔

سب لوگ چلے گئے تو امجد اپنے تینوں دوستوں کو گھر کے اندر لے گیا اور کھانے پینے کا بندوبست کرنے لگا۔ سخت محنت کے بعد ان کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ جو کچھ بھی موجود تھا، خوب سیر ہو کر کھایا پیا۔ کھانے کے دوران تہ خانے اور تابوت کا ذکر آ گیا۔ فارغ ہو کر چاروں نے موم بتیاں جلائیں اور تہ خانے میں اُتر گئے۔

''جب ہم گئے ہیں تو یہاں فیوز کا ڈبا پڑا تھا۔ اب نہیں ہے۔'' نوکر نے کہا۔

''کوئی اُٹھا کر لے گیا ہو گا تاکہ ہم اندھیرے میں ٹھوکریں کھائیں۔'' عمار نے کہا۔

چاروں لڑکے ایک قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔ اس مرتبہ موم بتیاں دو کی بجائے چار تھیں۔ اس لیے روشنی زیادہ تھی۔ ٹوگو سب سے پیچھے تھا۔ عامر نے آگے بڑھ کر خفیہ دروازے کے کنٹرول بٹن دبائے تو ایک بلاک اندر کی طرف کھسک گیا اور وہ اندر داخل ہوئے۔ روشنی میں تابوت بھی پہلے سے زیادہ واضح نظر آیا اور چھت سے لٹکتے ہوئے مکڑی کے جالے بھی۔

''کتنی بھیانک جگہ تجویز کی ہے کسی نے اپنا تابوت رکھنے کے لیے۔'' ٹوگو نے اپنے بالوں پر سے جالے جھاڑتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

''لیکن زومبی کے لیے ایسی ہی جگہ موزوں ہے۔'' عمار بولا۔

عامر ہاتھ میں موم بتی لیے سامنے کی دیوار کی طرف بڑھا جہاں ایک قطار میں کچھ قبریں تھیں، جو پہلے نظر نہیں آئی تھیں۔ وہ ان کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ اچانک دروازے کے زور سے بند ہونے کی آواز پر چونک اُٹھے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو خفیہ دروازہ آدھا سرک گیا تھا، مگر بند نہ ہو سکا تھا کیوں کہ آتے ہوئے عامر نے قریب پڑا ہوا ایک پتھر پیر سے سرکا کر اٹکا دیا تھا۔ تینوں تیز تیز قدم اُٹھاتے دروازے پر پہنچے تو اس کے دوسری طرف ٹوگو بوکھلایا ہوا سا کھڑا تھا۔

''تم نے بٹن دبایا تھا؟'' عامر نے ٹوگو سے پوچھا۔

''میں نے راستہ دیکھنے کے لیے شمع اوپر اُٹھائی تو میرا ہاتھ شاید بٹن سے چھو گیا۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میں باہر جانا چاہتا تھا۔'' ٹوگو نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''ٹوگو ایسا لڑکا نہیں کہ ہمیں جان بوجھ کر ہراساں کرتا۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ......'' امجد کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی عمار بول اُٹھا: ''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' مگر شبہ اس کے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ یہی حال عامر کا تھا مگر اس نے بھی اپنے رویے سے کچھ ظاہر ہونے نہ دیا۔

زومبی کے متعلق باتیں کرتے وہ باہر کے تہ خانے میں پہنچے عامر نے خفیہ دروازہ بند کیا اور کہا: ''یہ زومبی کی ہر روز کی آمد و رفت کا راستہ ہے۔''

''سنا ہے سرکس میں بھی ایک زومبی ہے۔ کوئی آرکن نام کا ہسپانوی زومبی کا رول ادا کرتا ہے اور اس چھوٹے سے سائڈ شو کو لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔'' امجد نے بتایا۔

''تم نے دیکھا ہے؟'' عمار نے پوچھا۔

''نہیں، کلاس کے لڑکے بتا رہے تھے۔ پروگرام بناؤ تو سب مل کر سرکس دیکھنے چلیں۔'' امجد نے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ آرکن ہی فرصت کے وقت سرکس سے نکل آتا ہو اور لوگوں کو دہشت زدہ کرتا ہو؟'' عمار نے پوچھا۔

''نہیں، اس وقت سرکس یہاں نہیں تھا جب سے زومبی کو دیکھا جا رہا ہے۔'' عامر نے بھائی کے خیال کی تردید کی۔ ''ممکن ہے اس کا کوئی ساتھی ہو۔'' عمار بولا۔ ''معلوم ہو جائے گا۔'' عامر کہنے لگا۔ ''تمہیں سرکس والے کیس میں وہاں جانا تو ہے نا۔'' امجد نے کہا۔

(باقی آئندہ)

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں بلتستان کی شگر نامی وادی میں ایک نہایت ہی عقل مند ترکھان (بڑھئی) رہتا تھا جو کندہ کاری، پچی کاری اور دیگر چوبکاری کے فن میں انتہائی مہارت رکھتا تھا۔ اس کا نام چندن تھا۔ اس کے ایک بیٹے کے سوا اور کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ عموماً تعمیرات کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا تھا اور اس کے گھر کی دیکھ بھال اور بیٹے کی پرورش اس کی بیوی کیا کرتی تھی۔ چندن کا بیٹا جوان ہو گیا تو اس کی ماں مرگئی۔ اب چندن کے لیے گھر سے باہر کام کے لیے نکلنا مشکل ہو گیا۔

بیوی کے مرنے کے بعد گھر کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ صرف بیٹا تھا جو کام کرنے کا عادی نہ تھا۔ ادھر لداخ کے راجہ کی طرف سے پیغام پر پیغام آرہا تھا کہ اس کے محل کی تعمیر کے لیے چندن جلد از جلد پہنچ جائے۔ چنانچہ چندن نے لداخ روانگی سے پہلے بیٹے کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ تیاریاں مکمل کرنے کے بعد ایک لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ کچھ روز گزرنے کے بعد چندن نے بہو سے کہا:

"صبح میں اور تمہارا میاں لداخ کے سفر پر جا رہے ہیں، تم ہمارے لیے سامان کی تیاری کرلو۔" بہو نے ایک تھیلے میں ترکھان کے اوزار اور دوسرے تھیلے میں چند روٹیاں ڈال کر سامان باندھ دیا۔ صبح سویرے باپ بیٹا سفر پر روانہ ہوگئے۔ سامان پیٹھ پر اٹھائے چلتے چلتے وہ دونوں پہاڑ کے قریب پہنچ گئے۔ اس جگہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے نو چکر لگانے پڑتے تھے۔ اس میں نو موڑ تھے۔ پہلا موڑ عبور کیا تو چندن نے بیٹے سے کہا: "درّہ عبور کرنے کا بندوبست کرو۔" بیٹے نے تھیلے سے دو روٹیاں نکالیں اور دونوں نے ایک ایک روٹی کھا لی۔ دوسرے موڑ پر پہنچے تو باپ نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔ بیٹے نے کہا: "دو ہی روٹیاں تھیلی میں تھیں جو ہم نے کھا لی ہیں۔ اب ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔" باپ نے کہا: "اتنے لمبے سفر کے لیے صرف دو روٹیاں تھیلی میں ڈالی تھیں۔ یہ بے وقوف لڑکی میری بہو نہیں بن سکتی۔ چلو واپس چلتے ہیں۔" واپس گھر پہنچنے پر چندن نے بہو کو طلاق دلوائی اور کسی اور لڑکی کو اپنی بہو بنا لیا۔ اس بہو کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ اس طرح چندن نے دس لڑکیوں کو بہو بنایا اور یکے بعد دیگرے سب کو طلاق دلواتا گیا۔ اب چندن نے فیصلہ کیا کہ جب تک ایک عقل مند بہو کا بندوبست نہیں ہوتا، اس وقت تک لداخ کا سفر ملتوی رکھا جائے۔ چندن اب عقل مند بہو کی تلاش میں خود نکل کھڑا ہوا۔ دن بھر چلنے کے بعد وہ کسی گاؤں کے کنارے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تین لڑکیاں اُون دھن رہی تھیں۔ چندن نے لڑکیوں سے پوچھا

کہ میں دُور جگہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں تو بتاؤ کہ میں نے اُدھر سے اِدھر تک کتنے قدم اُٹھائے ہوں گے۔ یہ سن کر لڑکیوں کو سخت غصہ آیا اور کہا: ''ہم تمہارے قدم تھوڑے گنتے رہے ہیں۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بے ہودہ سوال پوچھتا ہے۔''

لیکن تیسری لڑکی نے چندن سے کہا: ''تم اُدھر سے یہاں تک ہم پر نظریں جما کر آئے ہو۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارے یہاں پہنچنے تک ہم نے کتنی بار اُون پر ضربیں لگائی ہیں۔'' چندن لڑکی کی بات سن کر اس کی دانائی سے بہت متاثر ہوا اور اس کے گھر جا کر اس کا رشتہ مانگ لیا اور اپنے لڑکے کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔

شادی کے چند روز بعد چندن نے پھر لداخ جانے کا ارادہ کیا اور بہو کو سامان سفر تیار کرنے کا کہا۔ رات کو بہو نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ تم اپنی ساری بیویوں کو کس وجہ سے طلاق دیتے رہے ہو۔ لڑکے نے اسے سارا قصہ سنا دیا۔ یہ سارا قصہ سننے کے بعد بیوی نے کہا: ''جب تمہارا باپ تم سے کہے کہ بیٹا! چڑھائی چڑھنے کا بندوبست کرو تو تم اسے ایک دو موڑ پر روٹی اور خوبانی کا خستہ وغیرہ کھلا دینا۔ پھر جب وہ تم سے دوبارہ ایسے ہی کہے تو تم شور مچاتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی کی طرف دوڑنا کہ چیتا آ گیا ہے۔ باپ بھی یہ سن کر چڑھائی عبور کرے گا اور آئندہ پھر طلاق کی نوبت نہیں آئے گی۔'' دوسری صبح باپ بیٹا پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ بیٹے نے پہلے موڑ پر باپ کو روٹی کھلائی اور دوسرے موڑ پر خوبانی کا خستہ کھانے کو دیا۔ تیسرے موڑ پر پہنچتے ہی باپ کے کچھ کہنے سے پہلے بیٹے نے شور مچا کر اوپر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ کل نو موڑ تھے، دو گزر چکے تھے۔ باپ نے وہ شور سن کر دو موڑ دوڑ کر طے کر لیے۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی چیتا نظر نہ آیا۔ بیٹا برابر دوڑے جا رہا تھا۔

باپ نے اسے روکا اور واپس چل پڑا۔ اسے بہو کی شیطانی کا پتا چل گیا تھا۔ لہٰذا گھر پہنچتے ہی اسے طلاق دلوا کر فارغ کر دیا اور کچھ دن بعد دوبارہ ایک عقل مند بہو کی تلاش میں سفر پر نکلا۔ راستے میں ایک شخص ملا جو اسی راستے پر سفر کر رہا تھا۔ چندن اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ شخص جوتے پہن کر چل رہا تھا اور چندن جوتے اُتار کر ہاتھ میں لیے ننگے پاؤں جا رہا تھا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد وہ ایک ندی پر پہنچ گئے۔ اب ندی کو عبور کرنا تھا۔ چندن نے جوتے پہن لیے لیکن اس کے ساتھی نے اپنے جوتے اُتار دیے اور اس آدمی نے اپنے جوتے پھر پہن لیے۔ اس شخص نے سوچا کہ چندن پاگل ہے۔ اتنے میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ چندن کے پاس دو روٹیاں تھیں۔ دونوں نے بیٹھ کر ایک ایک روٹی کھا لی اور پھر چلنے لگے۔ راستہ بھر چندن یہ کہتے ہوئے چلتا رہا: ''ایک روٹی میں نے خود کھا لی اور دوسری روٹی پانی میں پھینک دی۔'' اس شخص کو یہ سن کر سخت غصہ آیا کہ میں نے ایک روٹی ہی تو کھائی تھی اور وہ بار بار اسی کو دہرا رہا ہے مگر وہ چندن کو کچھ کہے بغیر چلتا رہا۔

ایک گاؤں میں پہنچے تو ایک جنازہ جا رہا تھا۔ چندن نے اس آدمی سے پوچھا: ''بھئی یہ لاش پرانی ہے کہ نئی؟'' ساتھی کو سخت غصہ آیا اور برہم ہو کر کہا: ''آج کوئی مرا ہو گا جسے یہ دفنانے جا رہے ہیں۔ دُنیا میں کوئی پرانی لاش بھی ہوتی ہے؟'' ساتھی کو یقین ہو چکا تھا کہ چندن پاگل ہے کیوں کہ الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔

کچھ دُور ایک مکان کے پاس سے گزرے تو مکان کی چمنی سے دُھواں نکل رہا تھا۔ چندن نے پوچھا: ''یہ دُھواں ٹھنڈا ہے یا گرم؟'' ساتھی نے جل کر کہا: ''دُھواں گرم ہی ہوتا ہے۔'' دونوں چلتے رہے۔ ایک جگہ ایک آدمی کاشت میں مصروف تھا۔ چندن نے پوچھا: ''یہ آدمی کھا کر کاشت کر رہا ہے یا کھانے کے لیے کاشت کر رہا ہے؟'' ساتھی نے مجبوراً جواب دیا: ''فصل کھانے کے لیے ہی کاشت کی جاتی ہے۔'' اتنے میں ساتھی کا گھر قریب آ گیا۔ رات ہو رہی تھی۔ چندن نے کہا: ''میں سامنے والے عبادت خانے میں رات گزاروں گا۔ تم گھر جاؤ لیکن گھر میں داخل ہونے سے پہلے تین بار کھانس لینا۔'' آدمی نے جان چھڑانے کے لیے کھانسنا شروع کیا۔ اتفاقاً اس کی بیٹی صحن میں نہا رہی تھی۔ آواز سن کر اس نے فوراً کپڑے پہن لیے۔ اتنے میں باپ اندر داخل ہو گیا۔ بیٹی نے باپ کو افسردہ پا کر پوچھا: ''راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' باپ نے سارا حال کہہ سنایا۔ بیٹی بولی: ''وہ شخص (چندن) پاگل نہیں بلکہ نہایت عقل مند ہے۔ اس کی ساری باتیں حکمت سے بھری ہوئی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس نے پانی میں جوتے پہن لیے۔ خشکی پر ننگے پاؤں چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیوں کہ راستے کی ہر چیز نظر آتی ہے لیکن پانی میں چونکہ راستہ صاف نظر نہیں آتا جس کی وجہ سے کوئی چیز چبھ جائے، آبی مکوڑوں کے کاٹنے اور پھسل کر گرنے کا خدشہ بھی رہتا ہے، اس لیے اس نے

پانی میں جوتے پہن لیے۔ دوسری بات وہ بار بار کہتا رہا: ''میں نے ایک روٹی کھا لی اور دوسری پانی میں پھینک دی۔'' اس سے مراد یہ تھی کہ جو روٹی اس نے کھائی وہ صرف پیٹ بھرنے کے کام آئی، گویا وہ بے کار تھی جب کہ جو روٹی آپ نے کھائی وہ اس کے لیے اجر کا باعث بن گئی۔'' یہ سن کر باپ حیران رہ گیا۔ پھر بیٹی نے کہا: ''پرانی لاش کا جو ذکر اس نے کیا اس سے مراد غریب و نادار شخص ہے۔ وہ مہینوں فاقے کرے کوئی نہیں پوچھتا۔ اس لیے غریب آدمی چلتی پھرتی لاش ہی ہوتا ہے۔ مرنے کے وقت بس دفنانے کی رسم ہی عمل میں آتی ہے حالانکہ وہ ایک پرانی لاش ہوتی ہے جب کہ نئی لاش سے مراد امیر آدمی ہے۔ اسے کانٹا بھی چبھے تو لوگ نکالنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ جب وہ مرتا ہے تو نئی لاش بن جاتا ہے۔'' باپ نے کہا: ''تم خوامخواہ اس کی باتوں کی تاویل کرتی ہو۔ اچھا بتاؤ ٹھنڈے اور گرم دھوئیں سے کیا مراد ہے۔'' بیٹی نے کہا کہ امیر گھرانوں کے چولہوں سے جو دھواں نکلتا ہے وہ گرم دھواں ہوتا ہے کیوں کہ اس پر قسم قسم کے کھانے پک رہے ہوتے ہیں جب کہ جو دھواں غریب گھرانوں کے چولہوں سے نکلتا ہے، وہ ٹھنڈا ہوتا ہے، کیوں کہ چولہے میں صرف تاپنے کے لیے لکڑی جل رہی ہوتی ہے اور ان پر پکتا کچھ نہیں۔''

یہ سن کر باپ بھی اس سے متاثر ہونے لگا۔ پھر بیٹی نے اگلی بات کی وضاحت کی: ''کچھ لوگ کھا کر کاشت کرتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کچھ لوگ کفایت شعاری سے کام لینے کے بجائے سب کچھ کھا پی کر ختم کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد قرض مانگ کر گزارہ کرتے ہیں اور کاشت کے موسم میں قرض چکانے کے لیے کاشت کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اس قرض کے چکر میں ہمیشہ پھنسے رہتے ہیں اور ہمیشہ کھا کر کاشت کرتے ہیں۔'' اب باپ کو یقین ہو گیا کہ وہ نہایت عقل مند آدمی ہے لیکن اب اسے تین بار کھانس کر گھر میں داخل ہونے کی ہدایت سمجھ نہیں آئی۔

اس نے بیٹی سے اس بات کا مطلب پوچھا تو بیٹی نے کہا: ''میں صحن میں اس خیال سے نہا رہی تھی کہ آپ ابھی نہیں آئیں گے۔ اگر آپ نہ کھانستے تو یونہی بے پردگی کے عالم میں داخل ہو جاتے۔'' اب اسے چندن سے اتنی عقیدت ہو گئی کہ اس نے سیدھا اس کے پاس جا کر اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

لیکن چندن نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس عبادت خانے میں رات گزار کر صبح کو کسی عقل مند بہو کی تلاش میں نکلے گا۔ اب وہ آدمی اپنے گھر گیا اور بیٹی سے کہا کہ وہ گھر تو نہیں آتا اس لیے اس کے کے لیے کھانا بنا لو کیوں کہ صبح وہ کسی عقل مند بہو کی تلاش میں نکل جائے گا۔ بیٹی نے سوچا کہ مجھے ایسے عقل مند آدمی کی بہو بننا چاہیے۔ پھر اس نے کھانا تیار کیا۔ دو روٹیاں دسترخوان میں لپیٹ لیں۔ کٹورے میں ترکاری کا شوربہ ڈالا اور گوشت کی تین بوٹیاں بھی ڈال دیں، ساتھ ہی باپ سے کہا کہ اس آدمی سے کہنا، آج تاروں کی تین، چاند کی دو اور موسم ابرآلود ہے۔ باپ کھانا تو لے گیا لیکن راستے میں کھانے میں سے ایک روٹی اور دو بوٹیاں خود کھا لیں اور آدھا شوربہ پی لیا۔ اس کے بعد کھانا لے گیا اور بیٹی کی بات چندن کے سامنے دہرا دی۔ چندن نے کھانا کھایا اور برتن دے کر کہا کہ بیٹی سے کہنا کہ آج تاروں کی بھی یکم تاریخ اور چاند کی بھی یکم تاریخ ہے اور موسم صاف ہے۔ اس آدمی نے گھر آ کر چندن کی باتیں بیٹی کو سنائیں تو وہ سمجھ گئی کہ باپ نے ایک روٹی، دو بوٹیاں اور آدھا شوربہ ہڑپ کر لیا ہے۔ اس نے باپ سے پوچھا تو باپ نے تصدیق کر دی۔ چندن اس آدمی کی بیٹی کی بات سے اتنا متاثر ہوا کہ صبح سویرے خود اس کے گھر گیا اور بیٹے کے لیے رشتہ مانگ لیا۔ رشتہ منظور ہوا اور کچھ ہی دنوں میں دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ اب چندن نے لداخ جانے کا ارادہ کیا اور ایک دن بہو سے کہا کہ کل میں اور تمہارا شوہر لداخ روانہ ہو رہے ہیں۔ ہمارے سفر کے لیے سامان تیار کر دو۔ بہو نے خانوں والا تھیلا بنایا اور ہر خانے کو خوبانی کے خستہ اور بادام سے بھر دیا۔ ایک اور تھیلی میں گوشت کے پکے ہوئے ٹکڑے ڈال دیے۔ دوسرے تھیلے میں بڑھئی کے اوزار ڈالے اور اس طرح سامان تیار کر دیا۔ اس کے بعد شوہر کو بلا کر سمجھایا کہ جب وہ چڑھائی پر پہنچیں اور باپ کہے کہ چڑھائی چڑھنے کا بندوبست کرو تو ہر موڑ پر تھیلی کے ایک خانے کو کھول کر اس میں جو کچھ ہے، باپ کو کھانے کے لیے دے دے۔ جب باپ تھکن دور کرنے کے لیے آرام کرے تو گوشت کے ٹکڑے اس کو پیش کرے، اسی طرح چڑھائی ختم ہو جائے گی۔ جب باپ چڑھائی کے آخری مرحلے

میں آرام کرنے بیٹھ جائے تو تم بانسری بجانا۔ یہ کہہ کر اس نے شوہر کے سامان میں ایک بانسری بھی رکھ دی۔ جب دوسری صبح وہ دونوں روانہ ہوئے تو چندن کے بیٹے نے ایسا ہی کیا۔ دونوں نے ختہ، بادام اور گوشت کھاتے ہوئے درّے کو عبور کیا۔

درّے کی چوٹی پر جب وہ آرام کرنے کے لیے بیٹھے تو بیٹا اس انداز سے بانسری بجانے لگا کہ چندن کی ساری تھکن اور پریشانیاں ختم ہوگئیں۔ بانسری کی آواز سن کر لداخ کے راجہ کے سپاہی استقبال کے لیے پہنچ گئے۔ لداخ کے راجہ نے بھی ان کا خیر مقدم کیا۔ اب محل بنانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ بادشاہ نے چندن اور اس کے بیٹے کی خدمت کے لیے ایک خدمت گار بھی رکھ دیا۔ چند سالوں میں محل کی تعمیر کا کام مکمل ہوگیا۔ ایسا عالی شان محل ارد گرد کے علاقہ میں کسی کو نصیب نہ تھا۔ محل دن میں سات رنگ بھی اختیار کرتا تھا اور اپنی جگہ سورج کے ساتھ ساتھ گھومتا بھی تھا۔ اس کی کندہ کاریاں بھی عجوبۂ روزگار تھیں۔ جب بادشاہ محل دیکھنے پہنچا تو دنگ رہ گیا۔ وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے دربار میں اعلان کروایا کہ کوئی درباری یہ بتائے کہ چندن کو کتنی دولت دینی چاہیے۔ اب کیا تھا، ہر شخص ایک سے بڑھ کر ایک تجویز دینے لگا۔ کسی نے کہا کہ خزانے کا دروازہ کھول کر کہا جائے کہ اپنی مرضی سے جتنا چاہو اُٹھا کر لے جاؤ۔ کسی نے کہا کہ دونوں کے وزن کو تول کر ہیرے جواہرات دیے جائیں۔ الغرض اسی طرح ہر ایک نے اپنی تجویز پیش کی۔ جب سب خاموش ہوگئے تو ایک وزیر دست بستہ اُٹھا اور ادب سے بولا: ''حضور جو بھی انعام عنایت فرمائیں، بس ایک بات مدِنظر رکھیں۔ ان دونوں کو روانہ کرنے سے پہلے ان کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں تاکہ یہ ایسا عالی شان محل کسی اور راجہ یا حکمران کے لیے نہ بنا سکیں۔'' یہ سن کر سب اس وزیر کو داد دینے لگے۔ راجہ نے بھی سر دُھنا اور ان دونوں کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ چندن کے خدمت گار نے یہ سنا تو وہ روتا ہوا چندن کے پاس بھاگا اور اسے ساری بات کہہ ڈالی۔ چندن کو بہت دکھ ہوا مگر اس نے عقل سے کام لیا۔ وہ رات گئے چپکے چپکے محل میں گیا اور محل کی مرکزی چابی نکال لی۔ محل کی عمارت کا توازن بگڑ گیا جس کی وجہ سے محل ٹیڑھا ہو گیا۔ جب صبح کے وقت راجہ کو خبر ہوئی تو اس نے چندن کو بلوا بھیجا۔ چندن آیا تو اس نے اس سے محل کے ٹیڑھے پن کا سبب پوچھا۔ چندن نے کہا کہ محل کے ٹیڑھے ہونے کی وجہ ایک ہی ہو سکتی ہے کہ راجہ کی نیت ٹیڑھی ہوگئی ہے۔ راجہ نے اسے بہرصورت محل ٹھیک کرنے کا حکم کیا۔ چندن نے عرض کی: ''عالی جاہ! محل کو سیدھا کرنے کا سامان میں گھر بھول آیا ہوں۔ اسے احتیاط سے لانا پڑے گا۔ یہ کام صرف آپ کے وزیر ہی کر سکتے ہیں۔'' راجہ نے اپنے وزیر فوراً بھیج دیے۔ جب وہ جانے لگے تو چندن نے کہا کہ گھر پر میری بہو سے کہنا کہ میں نے محل سیدھا کرنے کا سامان منگوایا ہے۔ وزیر گھر پہنچے تو انھوں نے بہو سے یہی کہا۔ بہو سمجھ گئی کہ اس کے سسر اور شوہر کسی مشکل میں ہیں۔ اس نے کہا: ''وہ سامان سامنے والے سفیدے کے اندر ہے۔ وہ ایک نازک سی چیز ہے۔ اسے احتیاط سے نکالنا پڑے گا۔ میں تنے کو چیر کر اس میں کھونٹی لگاتی ہوں تم ہاتھ ڈال کر وہ چیز نکال لینا۔'' جب سب وزیروں نے تنے میں ہاتھ ڈال لیے تو بہو نے تیزی سے کھونٹی نکال لی جس سے سب وزیروں کے ہاتھ تنے میں پھنس گئے۔ اب بہو نے اس سے پوچھا کہ اس کا شوہر اور چندن کس مصیبت میں گرفتار ہیں؟ سب نے سچ سچ سارا قصہ بتا دیا۔ بہو نے ان دو وزیروں کی جنھوں نے ہاتھ کاٹنے کی تجویز دی تھی، زبان اور ناک کاٹ ڈالے اور کہا کہ راجہ سے کہو کہ ٹیڑھا پن ٹھیک کرنے کا سامان مل گیا ہے۔ وہ دونوں وزیر بڑی بدحالی میں دربار پہنچ کر اپنی داستان سنانے لگے مگر زبان کٹی ہونے کی وجہ سے کسی کو ان کی سمجھ نہیں آرہی تھی۔ آخر بادشاہ نے کسی طرح سارا معاملہ سمجھ لیا۔ ان کی باتیں سن کر دربار کبھی ہنستا تھا، کبھی روتا تھا۔ اب بادشاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے چندن اور اس کے بیٹے کو مالا مال کر دیا اور عزت و احترام سے روانہ کیا۔ جب دونوں گھر پہنچے تو باقی وزیروں کو آزاد کر دیا۔ اس طرح نہ صرف چندن کی بہو کی دوڑ دھوپ رنگ لائی بلکہ دونوں وزیروں کو ان کی بدنیتی کا صلہ بھی مل گیا۔

(نوٹ: یہ کہانی دراصل ضلع کرگل کی کہانی ہے اور یہ محل اب بھی موجود ہے، مگر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ہے۔)

ابوالعلا معرّی (بالِ جبریل)

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات!
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

رانا محمد شاہد

پاکستان کے ثقافتی و روایتی کھیل......

کبڈی اور گلی ڈنڈا

جہاں لوگوں نے ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کی ہے، وہیں کھیلوں کے حوالے سے بھی دُنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ اب ایک انسان کمپیوٹر و انٹرنیٹ اور موبائل پہ اکیلا کھیل سکتا ہے۔ یعنی کمپیوٹر و موبائلز پہ ایسی ایسی گیمز ہیں کہ چند منٹ سے لے کر ساری ساری رات ختم نہیں ہوتیں۔ چنانچہ ان جدید ایجادات نے ہمیں ہمارے علاقائی و دیسی کھیلوں سے دُور ہی نہیں بلکہ بہت دُور کر دیا ہے۔ یہی علاقائی کھیل تھے جن کی وجہ سے علاقائی ثقافت اجاگر ہوتی تھی۔ کبھی یہ کھیل ہماری ثقافت کا آئینہ دار تھے، آج یہ وقت اور حالات کے ہاتھوں مٹتے جا رہے ہیں۔ یہاں ہم بہت سے علاقائی کھیلوں میں سے دو اہم ترین کھیلوں کا تذکرہ کریں گے جو کبھی ہمارے شہروں خصوصاً دیہاتوں میں نہایت شوق و اہتمام سے کھیلے جاتے تھے یعنی

1- کبڈی 2- گلی ڈنڈا

کبڈی:

کبڈی، جنوبی ایشیا کا صدیوں پُرانا کھیل ہے۔ یہ اس خطے یعنی پاک و ہند کے باسیوں کا مقبول ترین کھیل ہے۔ پاکستانی پنجاب اور بھارتی پنجاب اس کھیل کا سب سے بڑا مرکز ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے علاوہ یہ کھیل بنگلہ دیش اور ایران میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ جیسے جیسے ایشیائی باشندوں کی بڑی تعداد امریکہ، کینیڈا، انگلینڈ، نیوزی لینڈ اور دیگر یورپی ممالک میں آباد ہونا شروع ہوئی تو انہوں نے اس کھیل کو ان ممالک میں بھی روشناس کرایا۔

کبڈی شاید دُنیا کا واحد کھیل ہے جس میں نہ تو کسی قسم کے سامان کی اور نہ ہی بڑے میدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبڈی برصغیر کا مقبول ترین کھیل ہے۔ 1900ء میں پہلی بار کبڈی کی ترقی و ترویج کے لیے سوچا گیا۔ 1921ء میں بھارت کے صوبے مہاراشٹر میں بنائے گئے قوانین کے تحت یہ کھیل کھیلا گیا۔ 1923ء میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے ان قوانین کا اطلاق کرا کر آل انڈیا کبڈی ٹورنامنٹ کا انعقاد کرایا۔ جدید کبڈی کو 1930ء میں جنوبی ایشیا میں فروغ ملا۔

1936ء میں یہ کھیل بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل کرنے میں کام یاب رہا، جب پہلی مرتبہ برلن اولمپکس میں اسے متعارف کرایا گیا۔ اس موقع پر کبڈی کا نمائشی میچ منعقد کیا گیا جسے شائقین نے بے حد سراہا۔ اس کے بعد 1938ء میں یہ کھیل انڈین اولمپکس میں متعارف کرایا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ کھیل اس خطے میں بھی بہت مقبول ہوا۔ آل انڈیا کبڈی فیڈریشن 1950ء میں بنی۔ خواتین کی کبڈی گیمز 1955ء میں منعقد ہوئیں۔

1980ء میں پہلی بار ایشین کبڈی چمپئن شپ ہوئی۔ اسی

سال اس کھیل کو ایشین گیمز کا حصہ بنا لیا گیا۔ پہلی چیمپئن شپ میں بھارت نے بنگلہ دیش کو شکست دی۔ 2004ء میں کبڈی کا پہلا ورلڈ کپ بھارت میں کھیلا گیا جس کے فائنل میں بھارت نے ایران کو شکست دے کر عالمی چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ 2006ء میں 15 ویں ایشین گیمز میں یورپین اور آسٹریلوی شائقین نے بھی اس کھیل میں گہری دل چسپی ظاہر کی جس کے نتیجے میں یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں کبڈی کو فروغ ملا۔

آج کبڈی دُنیا کا مقبول ترین کھیل ہے۔ اس کے چار عالمی کپ منعقد ہو چکے ہیں اور ان چاروں عالمی کپ کا فاتح بھارت رہا ہے۔

گلی ڈنڈا:

گلی ڈنڈا بھی ایک دل چسپ، انوکھا اور پُرانا کھیل ہے۔ یہ کھیل برصغیر میں پنجاب کے جنوبی اور سندھ کے بھی چند علاقوں میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ کھیل کھلے میدانوں میں کھیلا جاتا ہے۔ انگریزوں نے اپنے دور میں مربع بندی کرتے وقت ایسا کیا کہ جتنی جگہ آبادی کے لیے چھوڑی، اتنی ہی جگہ گاؤں کے ایک جانب اور اتنی ہی جگہ دوسری جانب چھوڑی تا کہ لوگ تفریح کے لیے کھیل سکیں۔ اس کھیل میں جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، ایک ڈنڈے اور ایک گلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں درخت سے کھلاڑی ایک ڈھائی فٹ یا تین فٹ کا ڈنڈا کاٹتے، پھر اس ڈنڈے کو کسی چھری یا کلہاڑی سے صاف کرتے ہیں۔ اس کے بعد 1/2 فٹ کی خشک لکڑی لیتے ہیں جس کا محیط ایک سے دو انچ ہو۔ اس کو ترکھان سے دونوں سائیڈوں سے تراش خراش کر کے سروں کو گول کروا لیتے ہیں، اس کو گلی کہتے ہیں۔ دو کے علاوہ جتنے چاہیں، کھلاڑی کھیل سکتے ہیں۔ یعنی اس میں کھلاڑیوں کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہے۔ کھلے میدان میں گول دائرے کی صورت میں باؤنڈری بنائی جاتی ہے۔ کھیلنے والی جگہ پر راب نکالی جاتی ہے۔ راب گلی کے مطابق کھودی جاتی ہے جہاں گلی مخصوص انداز میں منہ اُونچا کر کے رکھ دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ڈنڈا رکھنے کے لیے ڈنڈے جتنی ایک لائن لگا دی جاتی ہے۔ کھلاڑی میدان میں پھیل جاتے ہیں تو ایک کھلاڑی گلی کو راب میں رکھ کر ڈنڈے سے ضرب لگاتا ہے۔ گلی ہوا میں اُچھلتی ہے تو کھلاڑی زور سے گلی کو ڈنڈے سے ضرب لگاتا ہے جس سے وہ ہوا میں اُچھلتی دُور تک جاتی ہے۔ اگر وہاں موجود کھلاڑیوں میں سے کوئی اس گلی کو کیچ کر لے تو ہٹ لگانے والا کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر ڈنڈے کو اس چھوٹے سے سوراخ کے پاس رکھ دیا جاتا ہے اور میدان میں موجود وہ کھلاڑی جس کے سب سے قریب گلی گری ہو، اس کو اُٹھا کر ڈنڈے کی طرف پھینکتا ہے۔ اب اگر گلی ڈنڈے کو لگ جائے تو وہ کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو مسلسل وہی کھلاڑی کھیلتا رہتا ہے۔ یوں ہر کھلاڑی انفرادی طور پر اپنا الگ الگ سکور بناتا ہے۔

گلی ڈنڈا کا بین الاقوامی سطح پر صرف ایک ہی ٹورنامنٹ منعقد ہوا ہے جو پاکستان اور بھارت کے درمیان کھیلا گیا تھا۔ یہ ٹورنامنٹ پاکستان نے دو، تین سے جیت لیا تھا۔

☆☆☆

راشد علی نواب شاہی

پیارے اللہ کے پیارے نام

اَلعَفُوُّ جَلَّ جَلَالُہٗ

(بہت زیادہ معاف کرنے والا)

اَلعَفُوُّ جَلَّ جَلَالُہٗ گناہوں کو معاف کرنے والا اور گناہوں کے کرنے پر جو سزائیں ہیں ان سزاؤں کو بھی اپنے بندوں سے ہٹانے والا ہے۔ قرآن کریم میں یہ مبارک نام پانچ مرتبہ آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ معاف کرتے ہیں تو معافی کو پسند بھی کرتے ہیں۔ مثل مشہور ہے: ''بدلہ لینے سے معاف کر دینا بہتر ہے۔''

کلاس میں کئی لڑکے اکٹھے پڑھتے ہیں۔ کھیل کے دوران اکٹھے کھیلتے ہیں، گھر میں خاندان کے افراد اکٹھے رہتے ہیں تو اس دوران ایسی باتیں ہو جاتی ہیں جو طبیعت کو اچھی نہیں لگتیں۔ اس ناگواری پر صبر کر کے دوسروں کو معاف کر دینا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ جس طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ہمیں معاف کیا جائے، اسی طرح اگر کسی دوسرے سے بھی غلطی ہو جائے جو ہمیں ناگوار لگے تو وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ اسے بھی معاف کر دیا جائے۔

معافی

پہلے زمانے کی بات ہے کہ ایک شخص کے پاس بہت مال و دولت تھی، لیکن اس نے اپنی عمر میں کوئی نیکی کا کام نہیں کیا۔ جب وہ بیمار ہو گیا تو اسے خیال آیا کہ میں نے کوئی نیک کام نہیں کیا، مرنے کے بعد تو اللہ تعالیٰ مجھے وہ عذاب دیں گے جو کسی اور کو نہ دیا ہو گا۔ اس خوف میں اسے ایک خیال آیا اور اپنے بیٹوں سے کہا:

''اللہ تعالیٰ کے لیے میں نے کوئی نیکی کا کام نہیں کیا، اس لیے تم میرے مرنے کے بعد مجھے جلا دینا اور پھر میری آدھی راکھ کو مختلف جگہوں پر زمین میں بکھیر دینا اور آدھی سمندر میں پھینک آنا۔''

اس کے مرنے کے بعد بیٹوں نے ایسا ہی کیا۔

اگرچہ اس کو یہ معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے دوبارہ اسے زندہ کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا کہ اس کی راکھ پوری زمین سے ایک جگہ اکٹھی کر دے۔ زمین تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابند ہے، اس نے فوراً ایک ہی لمحے میں اس کی وہ راکھ جو زمین پر تھی اسے جمع کر دیا۔ سمندر کو بھی یہی حکم ہوا تو اس نے بھی زمین کی طرح کیا۔ جب اس مرنے والے کی ساری راکھ جمع ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے اسے دوبارہ زندہ کر دیا اور اس سے اس عجیب و غریب کام کروانے کی وجہ پوچھی۔ (حالاں کہ اللہ تعالیٰ پہلے سے جانتے تھے کہ اس نے اس طرح کیوں کیا) اس شخص نے کہا: ''اے میرے رب! آپ خوب جانتے ہیں، یہ میں نے آپ کے خوف اور ڈر سے سارا کام کروایا تھا۔''

اللہ تعالیٰ نے اس کے اس خوف کی وجہ سے اسے معاف کر دیا اور اس کی مغفرت فرما دی۔

عزیز ساتھیو! اللہ تعالیٰ کے لیے کیا مشکل ہے دوبارہ زندہ کرنا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے ڈر کو اتنا پسند کیا کہ اسے معاف فرما دیا۔

بوجھو تو جانیں

1- جس شے کو ہر دیس میں پایا
اس کی صورت ہے نہ سایہ

2- بات چھپے نہ اس سے اصلی
گن لے سب کی ہڈی پسلی

3- آندھی ہو یا تیز ہوا
کبھی بجھے نہ ایک دیا

4- باتوں باتوں میں وہ کھایا
کھا کر بھی ثابت ہی پایا

5- رتی بھر سا پیٹ
کھا گئی سارا کھیت

6- میں آ جاؤں تو تم کھو جاؤ
میں جاؤں تو تم آ جاؤ

7- لال گائے لکڑی کھائے
پانی پیئے اور مر جائے

8- خود اس کو کب پڑھنا آئے
جو چاہو لکھ کر دکھلائے

9- ہر چیز کو جوڑے آپس میں وہ پگلی
ایک طرف سے موٹی ہے ایک طرف سے پتلی

10- ناک چڑھے اور پکڑے کان
بوجھو ہے کون شیطان

دائرے میں کیا ہے؟

ان تصویروں میں سے کچھ کے نام نامکمل حروف میں دائرے میں لکھے ہوئے ہیں
کیا آپ انہیں مکمل کر سکتے ہیں؟

ارے بھئی کہاں چلے؟

ہندسوں کو احتیاط سے مکمل کیجیے۔ شاید پتا چل سکے کہ پرندے کہاں جا رہے ہیں!

حضرت بایزید بسطامیؒ

اندھیری اور بھیانک رات تھی۔ ساری دُنیا سو رہی تھی۔ دس گیارہ سال کا ایک بچہ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی میں بیٹھا اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔ قریب ہی اس کی ماں بستر پر میٹھی نیند سو رہی تھی۔ یکا یک ماں نے تکیے سے سر اٹھا کر کہا۔

''بیٹا! پیاس لگی ہے۔ ذرا پانی پلانا۔'' بچے نے کتاب بند کر دی اور فوراً صراحی تک پہنچا۔ صراحی خالی تھی۔ بچہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر گھر سے باہر نکلا کہ کسی ہمسائے کو آواز دے کر پانی مانگ لے لیکن پھر خیال آیا کہ آدھی رات ہو چکی ہے۔ پڑوسی دن بھر کے کام کاج کے بعد سو رہے ہوں گے۔ انہیں جگانا ٹھیک نہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ جہاں مکانات ختم ہوتے ہیں، وہاں پانی کا کنواں ہے۔ اندھیری رات اور ہُو کا عالم۔ باہر انسان تو کیا چرند پرند بھی دکھائی نہ دیتے تھے لیکن اپنی ماں کا خدمت گزار اور باہمت بیٹا صراحی اُٹھا کر کنوئیں تک پہنچ ہی گیا۔ جلدی سے پانی بھر کر واپس آیا اور گلاس لے کر ماں کے بستر تک گیا۔ ماں کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ماں کو اٹھائے یا نہ اُٹھائے۔ آخر وہ پانی سے بھرا ہوا گلاس لیے سرہانے خاموش کھڑا رہا۔ سوچا کہ جب اماں اُٹھیں گی تو پانی پلا دوں گا۔ وقت گزرتا گیا لیکن ماں اسی طرح آرام سے سوئی رہی۔ آخر صبح ہو گئی اور ماں کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ خدمت گزار بیٹا ہاتھ میں پانی کا پیالہ لیے کھڑا ہے۔ پہلے تو ماں کچھ نہ سمجھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ رات اس نے بچے سے پانی مانگا تھا۔ محبت کے جوش میں اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ اور دعا کی کہ

''اے اللہ! تو میرے بچے کا بھی اتنا ہی خیال رکھنا جتنا اس نے میرا خیال رکھا۔''

ماں کی دُعا قبول ہوئی اور وہ بچہ بڑا ہو کر ایک بڑے مرتبے کا بزرگ بنا جسے آج دُنیا بایزید بسطامیؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ بڑے بڑے اللہ والے بزرگ بھی ان کے طریقے پر چلنے کو اپنے لیے باعث برکت سمجھتے ہیں۔

بچو! آپ کو نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ بھی بایزید بسطامیؒ کے طریقے پر چلیں اور جہاں تک ہو سکے ماں کی خدمت کریں۔ کبھی اپنی امی اور ابا کو خفا نہ کریں۔ ہمیں معلوم ہے آپ یقیناً اپنی امی اور ابا کو خفا نہیں کریں گے اور ہمیشہ اچھے بچوں کی طرح ان کا کہا مانیں گے۔

(ترئین فاطمہ علوی، کراچی)
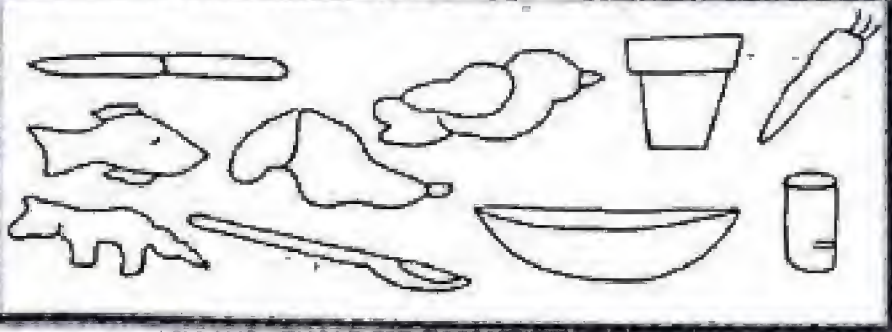
اوجھل خاکے
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجئے۔

مامون شفقت، اکوڑہ خٹک
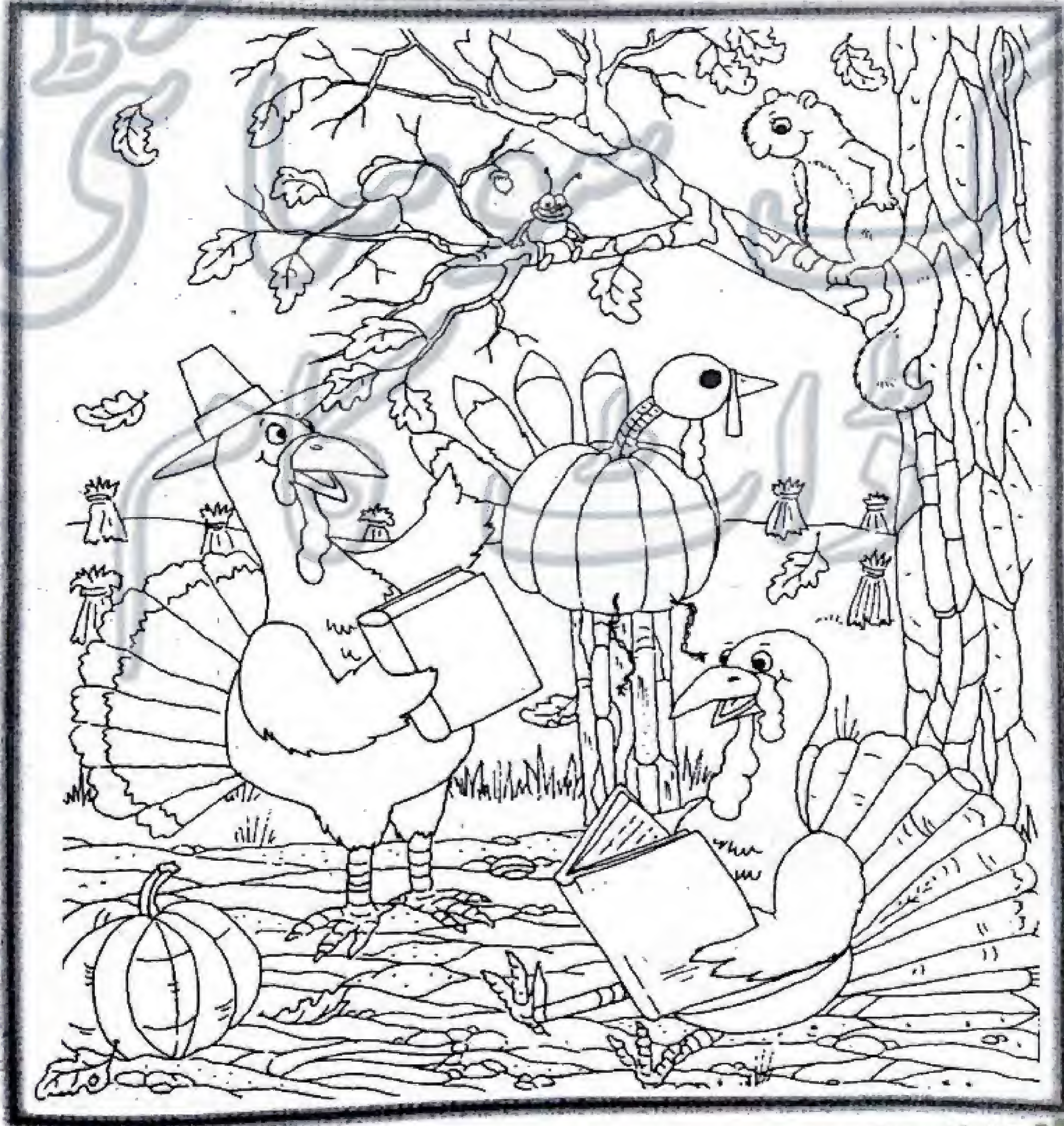
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا۔

محمد اسامہ سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ

میں بڑا ہو کر وکیل بنوں گا اور مظلوموں کی مدد کروں گا۔

محمد زبیر، بہاول پور

میں ایک کارآمد شہری اور ڈاکٹر بنوں گا۔

عائشہ گل سید، چارسدہ

میں پائلٹ بن کر پاکستان کا نام روشن کروں گی۔

محمد اسد جاوید، شیخوپورہ

میں بڑا ہو کر ایک ایمان دار بنک منیجر بنوں گا۔

توقیر احمد، لکھنو

میں ایک اچھا انسان بنوں گا۔

زاوش جدون، ایبٹ آباد

میں آرمی ڈاکٹر بن کر اپنے ملک کا نام روشن کروں گی۔

نمرہ فاروق، لاہور

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

قمر سلیم، کراچی

میں ایک کام یاب کرکٹ بیٹسمین بنوں گا اور پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

نبیرہ محمود، لاہور

میں استانی بنوں گی اور غریب بچوں کو مفت پڑھاؤں گی۔

محمد احمد، لاہور

میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

نوال خان، ڈیرہ غازی خان

میں ڈاکٹر بن کر پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

محمد عبداللہ، واربرٹن

میں پائلٹ بن کر ملک کی حفاظت کروں گا۔

محمد وقاص، جھنگ صدر

میں ایک اچھا قاری اور ڈاکٹر بنوں گا۔

احمد رضا قادری، گوجرانوالہ

میں بڑا ہو کر دین کی خدمت کروں گا اور غریبوں کی مدد کروں گا۔

محمد عمر یاسر، گوجرانوالہ

میں انجینئر بن کر ملک کا نام روشن کروں گا۔

ابدال شفقت، اکوڑہ خٹک

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔

رانا محمد حسین، کوٹ رادھا کشن

میں فوجی بن کر ملک کی حفاظت کروں گا۔

حمزہ جمیل، پشاور

میں پائلٹ بن کر ملک کی خدمت کروں گا۔

مختصر مختصر

صفائی نامہ

صفائی سی اب ہو گئی ہر طرف
اجالا ہوا ہے یہاں صف بہ صف
صفائی کا چرچا ہوا عام ہے
یہ سب کو صفائی کا پیغام ہے
صفائی سے سب تم محبت کرو
غلاظت سے ہر آن نفرت کرو
کوئی چیز بھی بچو! کھائیں گے جب
جراثیم تم کو ستائیں گے تب
غلاظت سے بچنے کا ہے یہ علاج
صفائی کا ضامن توانا دماغ
جراثیم سے سب کرو تم جہاد
صفائی کا نعرہ ”رہو زندہ باد“
صفائی تو ہے نصف ایمان بھی
کمر توڑ دی جس نے شیطان کی

(ضیاء اللہ محسن)

دادی اماں کہانی سناؤ

دادی اماں کہانی سناؤ
چاہے نئی یا پرانی سناؤ
ظالم جن یا سبز پری کی
طوطے یا جادو کی چھڑی کی
ہو جس پر حیرانی سناؤ
دادی اماں کہانی سناؤ
گڈے یا پھر اک گڑیا کی
چاند پہ بیٹھی اس بڑھیا کی
پڑھ کے یا پھر زبانی سناؤ
دادی اماں کہانی سناؤ
شہزادے یا شہزادی کی
جنگل کی یا آبادی کی
ہو جس میں آسانی سناؤ
دادی اماں کہانی

(شاہد حسین)

دوستی مت کرنا

☆ غرض مند لالچی سے......
☆ بدکار اور مکار سے......
☆ دوست کے دشمن اور دشمن کے دوست سے......
☆ چھچھورے اور شیخی خورے سے......
☆ بے جانے بوجھے اور بخیل سے......
☆ بے وقوف اور جھوٹی گواہی دینے والے سے......
☆ جس شخص سے ماں باپ منع کریں......
☆ بے جا کلام اور زیادہ قسمیں کھانے والے سے......

☆

یااللہ مجھے بچا

☆...... ایسی نیند سے جس سے فجر کی نماز قضا ہو۔
☆...... ایسی مصروفیت سے جس سے ظہر کی نماز قضا ہو۔
☆...... ایسی سستی سے جس سے عصر کی نماز قضا ہو۔
☆...... ایسی محفل سے جس سے مغرب کی نماز قضا ہو۔
☆...... ایسی تھکاوٹ سے جس سے عشاء کی نماز قضا ہو۔

(مائرہ حنیف، بہاول پور)

سنہری بول

☆ بُرے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہائی بہتر ہے۔
☆ حقیر سے حقیر پیشہ بھیک مانگنے سے بہتر ہے۔
☆ غرور سے آدمی کا دین ضائع ہو جاتا ہے۔
☆ خاموشی گفتگو کا حسن ہے۔
☆ نفرت دل کا پاگل پن ہے۔
☆ بخیل ہمیشہ ذلیل ہوتا ہے۔
☆ جو سوچتے کم ہیں، وہ بولتے زیادہ ہیں۔

☆ کم بولنا عقل مندی ہے۔
☆ عقل سے بہتر ہمارا کوئی رفیق نہیں۔
☆ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
☆ زیادہ ہنسنا موت سے غفلت کی نشانی ہے۔
☆ قلم تلوار سے زیادہ طاقت ور ہے۔
☆ مومن بار بار دھوکا نہیں کھاتا۔ (ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ)

انمول باتیں

☆ جن لوگوں کے خیالات اچھے ہوتے ہیں وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔
☆ اگر تم بادشاہ ہو، تب بھی اُستاد اور والدین کی تعظیم میں کھڑے ہو جاؤ۔
☆ ہر کسی کے ساتھ اخلاق سے پیش آؤ گے تو وہ تمہاری اتنی ہی عزت کرے گا جتنی تم اس کی۔
☆ جس کام کو پورا کرنے کی صلاحیت نہ ہو اس کا ذمہ نہ اُٹھاؤ۔
☆ مومن کے لیے اتنا علم کافی ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتا رہے۔
☆ آنکھ دل کا دروازہ ہے، اس کی حفاظت کرو کیوں کہ تمام آفات اس سے بدن میں داخل ہوتی ہیں۔
☆ اجڑے ہوئے دل کو آباد کرو گے تو کل تمہارے دل میں بھی اُجالا ہوگا۔ (محمد افضل انصاری، لاہور)

اقوال زریں

☆ خامیوں کا احساس کام یابیوں کی کنجی ہے۔
☆ ناکامی کام یابی کی طرف پہلی سیڑھی ہے۔
☆ ظالموں کو معاف کرنا مظلوموں پر ظلم ہے۔
☆ حوصلہ کبھی نہیں پوچھتا کہ پتھر کی دیوار کتنی اونچی ہے۔
☆ زندگی ایک ایسی شمع ہے جو ہوا میں رکھی ہوتی ہے۔
☆ غم کو برداشت کرنا بھی عبادت ہے۔
☆ کچھ کھانے کی خواہش ہو تو غم کھاؤ۔
☆ کچھ پینے کی خواہش ہو تو غصہ پیو۔
☆ کچھ جمع کرنے کی خواہش ہو تو آخرت کے لیے نیکیاں جمع کرو۔
☆ کچھ دینے کی خواہش ہو تو صدقہ و خیرات دو۔ (آمنہ اختر)

کلمات و برکات

☆ کوئی کام شروع کرو تو کہو...... بسم اللہ
☆ چھینک آئے تو کہو...... الحمدللہ
☆ خدا کے نام پر دو تو کہو...... فی سبیل اللہ
☆ کچھ کرنے کا ارادہ ہو تو کہو...... ان شاء اللہ
☆ کچھ اچھی خبر سنو تو کہو...... سبحان اللہ
☆ کسی کی تعریف کرنا ہو تو کہو...... ماشاء اللہ
☆ شکریہ ادا کرنا ہو تو کہو...... جزاک اللہ
☆ کسی کو رخصت کرنا ہو تو کہو...... فی امان اللہ
☆ جب خوش گواری ہو تو کہو...... تبارک اللہ
☆ غلط کام پر افسوس کرنا ہو تو کہو...... استغفراللہ
☆ موت کی یا حادثہ کی خبر سنو تو کہو...... انا للہ وانا الیہ راجعون
☆ جب ناگواری ہو تو کہو...... اعوذ باللہ (ہارون اشرف، رابعہ جنگ)

قرآن حکیم کا فرمان

☆ اپنے ماں باپ سے نیک سلوک کرو اور انہیں اُف تک نہ کہو۔
☆ بے شک نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔
☆ زمین پر اکڑ اکڑ کر نہ چلو کیوں کہ تم اسے پھاڑ نہیں سکتے۔
☆ نیک کام کرو تاکہ تم کام یاب رہو۔
☆ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
☆ خدا کسی دغا باز اور مکار کو پسند نہیں کرتا۔
☆ ایک جماعت دوسری جماعت کا مذاق نہ اُڑائے۔
☆ تم آپس میں ایک دوسرے کے نام نہ بگاڑو۔

مہمان کا سامان

جناب والا کہ یہ سات منزلہ صندوق؟
کسی مکاں کے لیے ہے کہ لامکاں کے لیے؟
جناب اس کا اگر ایک پٹ اکھیڑ سکیں
تو کام آئے محلے میں سائباں کے لیے
جناب نے جو گھڑایا ہے اس زمانے میں
کبھی بنا تھا تجمل حسین خاں کے لیے
جناب اس میں جو سامان ٹھنس کے لائے ہیں
یہ خاندان کے لیے ہے کہ سب جہاں کے لیے
لحاف، تکیے، ترازو، تندور غرضیکہ!
"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے"
جناب خود ہی بتائیں کہ ہم کہاں رکھیں!
نہ یہ زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے

(سید ضمیر جعفری) (مرسلہ: وقار صادق، راول پنڈی)

مٹن ملائی کباب

اجزاء:

بکرے کا قیمہ: ایک کلو — پیاز باریک: دو عدد کٹا ہوا — سبز مرچ: دو عدد کٹی ہوئی — سرخ مرچ پسی ہوئی: آدھا چائے کا چمچ
نمک: حسب ذائقہ — گرم مصالحہ: آدھا چائے کا چمچ — دھنیا پسا ہوا: ایک چائے کا چمچ — ڈبل روٹی کا سلائس: ایک عدد
دودھ: آدھی پیالی — انڈہ: آدھا پھینٹا ہوا — میدہ: حسب ضرورت — فریش کریم: آدھی پیالی
سبز دھنیا: ایک کھانے کا چمچ — ادرک، کٹا ہوا: آدھا کھانے کا چمچ — کوکنگ آئل: حسب ضرورت

گارنشنگ کے لیے:

سرخ مرچ: ایک چوتھائی چائے کا چمچ — گرم مصالحہ: ایک چوتھائی چائے کا چمچ — سبز مرچ: دو عدد کٹی ہوئی
سبز دھنیا: دو کھانے کے چمچ کٹا ہوا — نمک: حسب ذائقہ

ترکیب:

آدھی پیالی دودھ میں ڈبل روٹی کے سلائس بھگو دیں۔ گہرے پیالے میں قیمہ، پیاز، سبز مرچ، ادرک، سبز دھنیا اور ڈبل روٹی کا سلائس دودھ سے نکال کر نچوڑ کر ملا لیں۔ نمک، سرخ مرچ، پسا ہوا دھنیا، گرم مصالحہ اور انڈہ بھی قیمے میں ڈال کر ہاتھوں کی مدد سے اچھی طرح مکس کریں۔ قیمے کو مساوی حصوں میں تقسیم کر کے چپٹے پھر انڈے کی شکل کے کباب بنالیں۔ میدہ ایک پلیٹ میں پھیلا کر کبابوں کو اس میں رول کریں۔ فرائنگ پین میں آئل گرم کریں، تمام کبابوں کو چاروں اطراف سے گولڈن تل لیں۔ بیکنگ ڈش میں کباب رکھ کر اوپر سے فریش کریم ڈال دیں۔ پھر نمک، مرچ، گرم مصالحہ اور ایک کھانے کا چمچ سبز دھنیا چھڑک کر پہلے سے گرم اوون میں دو سو ڈگری سینٹی گریڈ پر بیس منٹ بیک کریں۔ سرونگ پلیٹ میں نکال کر کبابوں کے اوپر کٹی ہوئی سبز مرچ اور سبز دھنیا چھڑک دیں۔ لذیذ مٹن ملائی تیار ہیں۔

بیف روسٹ

اجزاء:

گائے کا انڈر کٹ گوشت: ایک کلو یا ثابت ران کا پیس — لہسن، ادرک پسا ہوا: دو کھانے کے چمچ — دہی: ایک کپ
سرکہ: ایک چوتھائی کپ — سیاہ مرچ: ایک چائے کا چمچ — چلی سوس: ایک کھانے کا چمچ — لال مرچ: ایک چائے کا چمچ، کٹی ہوئی
نمک: حسب ذائقہ پسا ہوا — پپیتا یا گوشت گلانے کا پاؤڈر — گھی: حسب ضرورت

ترکیب:

انڈر کٹ گوشت یا ران کا پیس لے کر اس کو کانٹے کی مدد سے اچھی طرح گود لیں۔ پھر تمام مصالحے ملا کر اسے ایک دن کے لیے رکھ دیں۔ ایک پتیلی میں دو کھانے کے چمچ گھی ڈالیں اور بغیر پانی کے گوشت کو اسے دو گھنٹے کے لیے ہلکی آنچ پر رکھ دیں۔ جب گل جائے اور سرخ ہو جائے تو اُتار لیں۔ لذیذ روسٹ تیار ہے۔ اگر چاہیں تو ایک کپ پانی بھی ڈال سکتی ہیں۔

جلال الدین محمد اکبر

ہندوستان میں مغلیہ خاندان کا تیسرا اہم ترین بادشاہ کا نام جلال الدین محمد اکبر تھا۔ آپ 15 اکتوبر 1542ء کو پیدا ہوئے۔ آپ 11 فروری 1556ء سے 27 اکتوبر 1605ء تک حکمران رہے۔ آپ کی پہلی شادی رقیہ سلطان بیگم سے ہوئی۔ بعدازاں مختلف ادوار میں شادیاں کیں۔ اندازاً آپ نے 13 شادیاں کیں۔ اکبر

بادشاہ کے والد کا نام ہمایوں تھا جب کہ والدہ کا نام حمیدہ بانو بیگم تھا۔ اکبر بادشاہ نے ابوالفضل اور فیضی جیسے اساتذہ سے فیض حاصل کیا لیکن باضابطہ تعلیم حاصل نہ کی۔ مشہور شخصیات جیسے بیربل، تان سین، ملادو پیازہ، راجہ مان سنگھ وغیرہ اس کے دربار میں وزراء کے برابر تھے۔ اکبر بادشاہ اعلیٰ منتظم تھا۔ آپ نے متعدد علاقے فتح کر کے سلطنت میں شامل کیے۔ اقلیتوں خاص کر ہندو اور راجپوت قوم کو بڑی اہمیت دی۔ اکبر بادشاہ نے ٹیکسوں کا نظام متعارف کروایا اور فوجی قوت بڑھائی۔ آگرہ کے نزدیک صوفی بزرگ حضرت سلیم چشتیؒ سے اکبر بادشاہ نے روحانی فیض حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر بادشاہ نے آگرہ شہر کو دارالخلافہ بنایا۔ اکبر بادشاہ نے تجارت کو فروغ دیا اور نئے نئے سکے(Coins) بھی متعارف کروائے۔ اکبر بادشاہ کے مشاغل میں تصویر کشی، تلوار چلانا اور گھڑسواری شامل تھے۔ جلال الدین محمد اکبر نے 27 اکتوبر 1605ء کی بوجوہ پیٹ کے مرض وفات پائی۔ آپ کو سکندرہ، آگرہ (بھارت) کے مقام پر دفن کیا گیا۔

شہد کی مکھی

شہد کی مکھی(Honey Bee) کا سائنسی نام"APIS" ہے۔ اس کا تعلق فائیلم آرتھروپوڈا کی کلاس"Insecta" سے ہے۔ ان کی20,000 انواع(Species) ہیں۔ اس کا ذکر قرآن حکیم کی سورت مبارکہ النحل پارہ 14 میں بھی موجود ہے۔ شہد کی مکھیوں کا مطالعہ کرنا"Apiology" کہلاتا ہے۔ انسان صدیوں سے انہیں شہد اور موم(Bees Wax) کے لیے پال بھی رہا ہے۔ نرمکھیوں کو ڈرونز(Drones) کہا جاتا ہے۔ مادہ مکھی کو ملکہ (Queen) کہتے ہیں۔ شہد کی چھوٹی مکھی کو "Apis Florea" کہتے ہیں۔ شہد کی مکھیاں 10 ڈگری سینٹی گریڈ (50 فارن ہائیٹ) سے نیچے درجۂ حرارت پر اُڑنا چھوڑ دیتی ہیں اور چھتے

میں قیام کرتی ہیں۔ یہ پھولوں کا رس چوستی ہیں جسے "Nectar" کہتے ہیں۔ کارکن مکھیاں (Worker Bees) پیٹ سے مادہ خارج کرتی ہیں جو چھتہ (Bee Wax) بناتا ہے۔ ان کے منہ پر ڈنک ہوتا ہے جو دفاع میں کردار ادا کرتا ہے۔ ان کا تیار کردہ شہد بطور غذا، دوا اور ڈشوں کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ چین، ترکی، ارجنٹائن، یوکرائن اور امریکہ دُنیا کے بڑے شہد پیدا کرنے والے ممالک ہیں۔ شہد کاربوہائیڈریٹس کا خزانہ ہے۔ شہد کی مکھی (Honey Bees) کے نام پر فلمیں، ڈرامے، کارٹونز اور ڈاکومینٹری بنائی جا چکی ہیں۔ مصری تہذیب میں شہد کی مکھیوں کو رشتوں کی مضبوطی دکھانے کے لیے بطور علامت ظاہر کیا جاتا تھا۔ شہد کی مکھی کی چھ ٹانگیں ہوتی ہیں اور یہ پَروں کی مدد سے اُڑتی ہیں۔

گولف

گولف (Golf) ایک کلب اور بال کا کھیل ہے۔ یہ کھیل ایسے میدان میں ہوتا ہے جس کی کوئی خاص حد مقرر نہیں۔ 9 یا 18

سوراخ (Hole) ہوتے ہیں۔ ان سوراخوں میں کھلاڑی ایک اسٹک (Stick) کی مدد سے گیند پھینکتا ہے جو کم سے کم ہٹ (Hit) کر کے آخری سوراخ تک گیند پہنچاتا ہے، وہ فاتح قرار پاتا ہے۔ گولف کے کھیل نے 15 ویں صدی میں اسکاٹ لینڈ سے جنم لیا۔ اس سے قبل قدیم رومن بھی اس کھیل سے واقف تھے۔ گراؤنڈ جس میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے، اس کی سطح اور اس پر اُگی گھاس کی سطح مختلف مقامات پر مختلف رکھی جاتی ہے تاکہ کھیل کو دل چسپ و مشکل بنایا جا سکے۔ زمین میں بنائے گئے یہ سوراخ دائیں اور بائیں رُخ پر رکھے جاتے ہیں۔ ان سوراخوں کو "Dogleg" کہا جاتا ہے۔ گولفر (اس کھیل کا کھلاڑی) گیند کو زمین سے کچھ بلند رکھنے کے لیے "Tee" استعمال کرتا ہے جو لکڑی کا ٹکڑا (Peg) ہوتا ہے۔ آج کل Tee پلاسٹک کے بھی بن رہے ہیں۔ جس سٹک کی مدد سے گیند کو مارا جاتا ہے اسے "Club" یا "Driver" کہا جاتا ہے۔ دُنیا بھر میں اس کے ٹورنامنٹ منعقد ہوتے ہیں۔

سیاہی

سیاہی کو انک (Ink) بھی کہتے ہیں جس کی مدد سے لکھا، چھاپا اور شائع کیا جاتا ہے۔ اس مائع نما ڈائی (Dye) یا پگمنٹ (Pigment)

کو قلم، برش یا پَر (Quill) کی مدد سے ڈرائنگ یا تحریر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سیاہی کو مختلف مقاصد جیسے کرنسی کی چھپائی، کتابوں، اخباروں وغیرہ میں استعمال کرنے کے لیے اس میں کئی کیمیائی مادے شامل کیے جاتے ہیں۔ سیاہی کو آبی (Aqueous)، مائع، پیسٹ (Paste) یا پاؤڈر کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سیاہی کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ قدیم چینی تاریخ بتاتی ہے کہ پلانٹ ڈائیز (Plant Dyes) سے سیاہی یا روشنائی 32 قبل مسیح تیار کی گئی اور جانوروں کے پَروں کو بطور قلم استعمال کیا گیا۔ آج کی روشنائی یا سیاہی ڈیجیٹل پرنٹرز میں بھی کام آتی ہے۔ سیاہی میں کیمیکلز ہوتے ہیں، اس لیے انک یا سیاہی کا پیٹ میں جانا نقصان پہنچاتا ہے۔ ووٹرز (Voters) کے انگوٹھے پر جو سیاہی لگاتے ہیں اس ان منٹ سیاہی کو "Indelible" انک کہتے ہیں۔

آب زم زم کے کنویں کی تعمیر

آب زم زم وہ چشمہ ہے جسے خداوند کریم نے اپنی رحمت اور حکمت سے سرزمین عرب کے گرم اور تپتے ریگزاروں میں خشک پتھروں کے درمیان تقریباً چار ہزار سال قبل حضرت اسماعیلؑ کی تشنہ لبی کو دور کرنے کے لیے جاری کیا تھا۔ یہ چشمہ بیت اللہ (مکہ معظمہ) میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی حضرت حاجرہؑ اور شیر خوار بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر عرب کے ریگستانوں میں آئے۔

قبیلہ جرہم کے کچھ لوگ کدا سے مکہ کے نشیبی علاقے کی طرف آئے اور زم زم کے مقام پر حضرت ہاجرہؑ کی اجازت سے وہاں بس گئے۔ مکہ معظمہ کی یہ پہلی باقاعدہ آبادی تھی۔ اسی مقام پر بعدازاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد اہل فارس بھی ادھر آئے۔ ایران کا بادشاہ ساسان بن بابق جو ساسانی خاندان کا بانی تھا، 266 قبل مسیح میں اس چشمے کی زیارت کو آیا۔ اسلام سے پہلے ایرانی بھی اس کنویں سے برکت حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ جب بنو جرہم مکہ سے جانے لگے تو انہوں نے قریش کے مشہور بتوں ''اسات'' اور ''نائلہ'' کے درمیان زم زم کے چشمے کو بند کر دیا۔ پھر حوادثِ زمانہ سے یہ چشمہ دب گیا۔ سینکڑوں سال بعد حضور اکرمؐ کے دادا عبدالمطلب کو خواب میں کنواں کھودنے کا حکم ہوا۔ انہوں نے اپنے بیٹے حارث کی مدد سے کنواں کھودا تو وہاں سے پانی برآمد ہوا۔ یہ چشمہ آج تک جاری ہے۔

زم زم کا کنواں مربع پتھروں پر بنا ہوا ہے۔ یہ سترہویں صدی عیسوی کی تعمیر ہے۔ موجودہ عمارت جس میں زم زم کا کنواں واقع ہے، 1661ء میں عثمانی ترکوں کے عہد میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ کنواں کعبے سے جنوب مشرق کی طرف 33 گز کے فاصلے پر حجر اسود کی دیوار کے بالمقابل واقع ہے اور 140 فٹ گہرا ہے۔ زم زم کے کنویں کے اوپر چوکور عمارت تعمیر کی گئی ہے جس میں شمال کی جانب دروازہ ہے۔ کمرے میں خوب صورت سنگ مرمر سے پچی کاری کی گئی ہے۔ کنواں عمارت کے عین درمیان میں ہے جس کے ساتھ ہی ایک حوض ہے جو ہر وقت آب زم زم سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں جہاں کنویں کے گرد پانچ فٹ منڈیر ہے۔ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے ٹیوب ویل لگے ہیں۔ 1374ھ میں شاہ عبدالعزیز آل سعود کے دور میں دو سبیلیں سنگ مرمر کی بنائی گئیں اور زم زم کے لیے نئی عمارت کی تعمیر کروائی گئی اور پانی نکالنے کا پرانا طریقہ ترک کر کے نیا طریقہ زیر استعمال لایا گیا۔ اس میں دو بڑی بڑی ٹینکیاں رکھی گئی ہیں جن کے ساتھ چوبیس بڑے نل ہیں۔ اس کے علاوہ مطاف کی کئی دفعہ توسیع کی گئی تاکہ زم زم سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

آب زم زم کی مقدار کا کوئی حتمی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس سلسلے میں پہلی کوشش 1391ھ میں سعودی وزارت زراعت نے کی۔ ایک ماہر نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس چشمہ سے ایک منٹ میں 164 سے لے کر 217 گیلن پانی پھوٹتا ہے۔ بین الاقوامی کمپنیوں نے اندازہ لگایا کہ ایک گھنٹے میں 60 میٹرک ٹن پانی نکلتا ہے۔ سب سے آخری رپورٹ جو اس کے متعلق موصول ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک سیکنڈ میں 11 اور 18 لیٹر کے درمیان پانی نکلتا ہے۔ اس بات پر سب ماہرین کا اتفاق ہے کہ چشمہ کا پانی تین پتھروں کے درمیان سے پھوٹتا ہے۔ یہ پتھر کعبہ، صفا اور مروہ کی طرف سے آ رہے ہیں اور زم زم کے کنویں پر ملتے ہیں۔ ☆☆

زبیدہ سلطانہ

بلی کے خواب میں چھیچھڑے ہی چھیچھڑے

فیروز نے کمرے میں آتے ہی ''شی'' کی آواز نکالی اور ساتھ ہی پاؤں زور سے زمین پر مارا اور فروا کی پالتو بلی روزی کو جگا کر باہر بھگا دیا۔ فروا نے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر جو کتاب وہ پڑھ رہی تھی، بستر پر پٹخ دی اور چلائی: ''فیروز کے بچے! تم نے پھر آرام سے سوئی ہوئی روزی کو شکار کر بھگا دیا۔ میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے، تم مجھے بھی ہمیشہ اسی طرح ڈرا کر جگا دیتے ہو جب میں کوئی پیارا سا خواب دیکھ رہی ہوتی ہوں۔'' بہن کی اس بات پر فیروز ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا، جب کہ فروا لگاتار بولتی اور اسے ڈانٹتی رہی۔

''واہ بھئی واہ! تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے روزی بھی خواب دیکھ رہی تھی اور میں نے اس کا سہانا سپنا توڑ دیا ہو۔'' فیروز خوب ہنس لینے کے بعد بولا۔ ''ہاں تو کیوں نہیں...... کیا بلیاں خواب نہیں دیکھ سکتیں؟'' فروا یقین سے بولی۔ ''تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے روزی تمہیں خواب سنایا کرتی ہے۔'' فیروز نے اسے چڑایا۔ ''وہ سنا نہیں سکتی مگر میں تو سمجھ سکتی ہوں نا کہ وہ ضرور خواب دیکھتی ہے۔'' فروا نے کہا۔

''بھلا تمہارے خیال میں وہ کیا خواب دیکھتی ہو گی؟'' فیروز نے مسکرا کر پوچھا۔ ''مثلاً...... وہ بہت سارے چھیچھڑوں کا خواب دیکھ سکتی ہے کیوں کہ اسے چھیچھڑے بہت پسند ہیں۔''

فیروز ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ ان کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور انہیں بتایا کہ ابو کھانے پر ان کا انتظار کر رہے ہیں اور وہ دونوں اپنی بحث ادھوری چھوڑ کر اُٹھ گئے۔ اگلی صبح دونوں اسکول کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آئے۔ فروا نے بیٹھتے ہی خوش ہو کر کہا: ''امی جی! میں نے رات خواب دیکھا کہ ابو میرے لیے بڑے پیارے پیارے کپڑے لائے ہیں۔'' اس پر فیروز ایک دم قہقہہ لگا کر بولا: ''واہ وا! جیسے ان کی بلی چھیچھڑوں کے خواب دیکھتی ہے، یہ کپڑوں کے خواب دیکھتی ہیں۔''

امی ابو نے یہ سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس لیے جب کوئی شخص اپنی دل پسند چیز کا شوق کرتا یا اسی کے بارے میں سوچتا ہے تو کہتے ہیں: ''بلی کے خواب میں چھیچھڑے ہی چھیچھڑے۔''

1857ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی مسلمانوں کے لیے بے پناہ مصائب لے کر آئی۔ انگریز جس نے آہستہ آہستہ پورا ہندوستان اپنے قبضے میں لے لیا تھا، اس نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر جنگِ آزادی کا خوب بدلہ مسلمانوں سے لیا۔ سرعام مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ کچھ کو توپ کے گولے کے ساتھ کھڑا کر کے شہید کیا گیا اور کئی کالا پانی (جزائر انڈیمان) پہنچے۔ ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کو ذہنی اور جسمانی اذیت سے دوچار کیا گیا۔ الغرض ہندو اور انگریز، دونوں قوموں نے مسلمانوں کے لیے زندگی اجیرن کر دی۔

ایسے نازک دور میں، جب مسلمان خوف زدہ اور سخت مایوسی کا شکار ہو گئے تھے، سرسید احمد خان کی صورت میں انہیں ایک ایسا مسیحا ملا جو ان کے درد کا علاج بخوبی کر سکتا تھا۔

سرسید احمد خان کے ابتدائی حالات سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں آنکھ کھولی۔ سخت مذہبی اور تربیتی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب گھر کا کوئی فرد ننگے سر کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بچپن میں ایک بار انہوں نے اپنے ملازم کو تھپڑ مار دیا۔ والدہ نے انہیں گھر سے نکال دیا اور واپسی کی شرط یہ ٹھہری کہ وہ ملازم سے معافی مانگیں گے۔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا اور گھر کا نظام چلانے کے لیے ملازمت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اپنے ایک رشتہ دار کی وساطت سے انہوں نے کچہری (عدالت) میں کام سیکھا اور پھر کچھ عرصہ بعد سررشتہ دار (ریڈر، کورٹ کا ایک عہدہ) بن گئے۔ اس کے بعد وہ کمشنر کے دفتر میں منشی مقرر ہوئے۔ 1841ء میں انہیں فتح پور میں جج مقرر کیا گیا۔ جب جنگِ آزادی برپا ہوئی تو اس وقت وہ بجنور میں ملازمت کر رہے تھے۔

اس جنگ کی ناکامی گویا مسلمانوں کی ناکامی تھی اور سب سے زیادہ عتاب کا شکار بھی مسلمان ہی ہوئے۔ ایسے وقت میں سرسید احمد خان جو کہ انگریزی حکومت کے ملازم تھے، انہوں نے کتاب ''اسباب بغاوتِ ہند'' لکھ کر انگریز سرکار کو جنگ کے اصلی حقائق سے آگاہ کیا۔ یہ ایک گستاخانہ حرکت بھی ہو سکتی تھی۔ ان کے ایک دوست نے انہیں اس کتاب کی اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر انہوں نے اس کام کو فرض جانا اور اسے مکمل کر کے ہی دم لیا۔

سرسید احمد خان کا ایک بڑا کارنامہ ہندوستان کے مایوس اور مظلوم مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا۔ بالخصوص ایسے حالات میں جب انگریزوں سے نفرت کے باعث انگریزی تعلیم کفر سمجھی جاتی ہو۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ انگریزوں اور

ہندوؤں کی غلامی سے آزادی کے لیے ہمیں تعلیمی میدان میں خود کو منوانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ہم اپنے دشمن انگریز کو ہندوستان سے باہر نکال کر ہندوؤں سے آزاد ہو سکیں گے۔ تقریباً 75 سال بعد دُنیا نے دیکھا کہ سرسید احمد خان کی بات کتنی سچی تھی جب 1947ء میں مسلمانوں نے اپنا ایک علیحدہ ملک پاکستان حاصل کر لیا۔ یہ تعلیم، مقصد اور سچائی کی فتح تھی۔

عملی کام کا آغاز کرتے ہوئے سرسید احمد خان نے 1875ء میں علی گڑھ میں ایم اے او اسکول قائم کیا جہاں عربی، فارسی، انگریزی، حساب، تاریخ اور جغرافیہ کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اس اسکول کا الحاق کلکتہ یونی ورسٹی سے تھا۔ صرف دو سال بعد ہی اس اسکول کا درجہ بڑھا کر اسے کالج بنا دیا گیا۔ اب کالج کے معاملات چلانے کے فنڈز کی کمی محسوس ہوئی تو سرسید احمد خاں خود ہی چندہ جمع کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کی انگریزوں سے قربت اور مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دلانے جیسے کام، عام مسلمانوں کے لیے قابل نفرت تھے۔ اس لیے چندہ جمع کرنے کے دوران انہیں سخت جملے بھی سننے کو ملے مگر مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں سرخرو کرنے کا عزم ان سے سارے کام کراتا رہا اور وہ خوشی خوشی ہتک بھی برداشت کرتے رہے۔ کالج کی ترقی کا عمل شروع ہوا تو یہاں سے تعلیم حاصل کر کے نکلنے والے مسلمانوں نے عملی زندگی میں وہ مقام حاصل کیا، جس کا تصور اس سے پہلے انگریزوں کے بنائے ہوئے اسکولوں کے طالب علموں تک محدود تھا۔

علی گڑھ کے اس کالج نے بعد میں یونی ورسٹی کا درجہ بھی حاصل کیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ہندوستان کے عظیم مقرر اور مسلمان کے رہ نما سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے اس جملے سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے ایک مرتبہ یونین ہال میں تقریر کے آغاز سے قبل ادا کیا تھا:

''میں جب لاہور سے چلا تو احباب نے کہا کہ اگر علی گڑھ کے مسلمانوں سے خطاب کرنا ہے تو شہر کی جامع مسجد میں تقریر کرنا اور اگر پورے ہندوستان کے مسلمانوں سے کچھ کہنا ہے تو یونی ورسٹی میں تقریر کرنا۔''

سرسید احمد خاں ہندوستان میں دو قومی نظریے کی وضاحت میں بھی پیش پیش تھے۔ جنگِ آزادی کے بعد انہوں نے ہمیشہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور یک جہتی برقرار رکھنے پر زور دیا، مگر جب 1867ء میں بنارس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے رسم الخط اور زبان کو ختم کرنے کی کوشش کی تو سرسید احمد خان نے اسی دن کہہ دیا کہ اب مسلمانوں اور ہندوؤں کے راستے جدا جدا ہیں۔

سرسید احمد خان تصنیف و تالیف کے میدان میں سرگرم رہے۔ انہوں نے کتاب ''آثار الصنادید'' لکھی جس میں پرانی اور شکستہ تاریخی عمارتوں کا حال درج تھا۔ اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس کتاب کے بعد رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے انہیں اپنا آنرری فیلو منتخب کیا۔

تاریخ کے حوالے سے بھی انہوں نے بے حد معیاری کام چھوڑا ہے۔ ایک انگریز ولیم میور نے اپنی کتاب ''دی لائف آف محمدؐ'' میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور کتاب میں اعتراضات کیے۔ سرسید احمد خان نے اس کا جواب دینے کے لیے اپنا سارا اثاثہ فروخت کیا اور لندن پہنچے جہاں کے بڑے کتب خانوں میں وہ علمی مواد موجود تھا، جس سے وہ ولیم میور کے اعتراضات کا دلائل کے ساتھ جواب دے سکتے تھے۔ ان کے عزم اور ارادے کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنے دوست نواب محسن الملک کو 20 اگست 1869ء کو لکھا:

''ان دنوں میرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور نے جو کتاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات میں لکھی ہے، اس کو دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل جلا دیا ہے۔ اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا ہے۔ میں نے مصمم ارادہ کیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ وآلہ وسلم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کہ کتاب لکھ دی ہے اور اگر تمام خرچہ ختم ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے۔ قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔''

ملت اسلامیہ کا یہ عظیم رہ نما اپنے حصے کا کام کر کے 17 مارچ 1897ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ ان کے انتقال کے 23 سال بعد ان کا خواب یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ 1920ء میں علی گڑھ کالج، یونی ورسٹی بن گیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ قائداعظم محمد علی جناح کے اس جملے سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے تحریک پاکستان کے دوران کہا تھا: ''علی گڑھ یونی ورسٹی مسلم لیگ کا اسلحہ خانہ ہے۔''

ایک دوست (دوسرے دوست سے): ''آج میں نے ایک بہت بڑے آدمی کی جیب کاٹی ہے۔''
دوسرا دوست: ''تمہیں کسی نے پکڑا نہیں؟''
پہلا دوست: ''مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا کیوں کہ میں درزی ہوں۔''
(شائلہ ناز، محمد ضیاء اللہ، میانوالی)

ایک دوست (دوسرے دوست سے): ''مجھے اپنا فون نمبر لکھوا دو۔''
دوسرا دوست: ''ابھی میرے پاس ٹائم نہیں، فون کر کے پوچھ لینا۔''

☆

اُستاد: ''بتاؤ! امریکہ کہاں ہے؟''
شاگرد: ''جناب مجھے نہیں معلوم۔''
اُستاد: ''تم ڈیسک پر کھڑے ہو جاؤ۔''
شاگرد (کھڑے ہونے کے بعد): ''جناب! یہاں سے بھی نظر نہیں آ رہا۔''
(خدیجہ شجاعت، لاہور)

خریدار: ''کیا یہ کپڑا اونی ہے؟''
دُکان دار: ''جی ہاں، بالکل اونی ہے۔''
خریدار: ''مگر اس پر لیبل تو سوتی کا لگا ہوا ہے؟''
دُکان دار: ''جناب یہ تو چوہوں کو دھوکہ دینے کے لیے لگایا ہے۔''

☆

پولیس انسپکٹر: ''تم نے کمپنی کے مینجر کا ہاتھ کیوں جلا دیا؟''
نوجوان: ''سر! صاحب سے نوکری مانگنے گیا تو وہ بولے کہ پہلے میری مٹھی گرم کرو، تو میں نے جلتا ہوا کوئلہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔''
(مائرہ حنیف، بہاول پور)

اُستاد: ''بتاؤ وہ نہا رہے ہیں، میں نہا رہا ہوں، سب نہا رہے ہیں، یہ کون سا زمانہ ہے۔''
شاگرد: ''جناب! یہ عید کا زمانہ ہے۔'' (سحر فاطمہ)

ڈاکٹر: ''بچے کو پانی دینے سے پہلے اُبال لیا کریں۔''
آدمی: ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اُبالنے سے بچہ مر تو نہیں جائے گا۔''
(عدن سجاد، جھنگ صدر)

ایک بچہ (دوسرے بچے سے): ''سورج کہاں سے نکلتا ہے؟''
دوسرا بچہ: ''اگر تم یہ سوال کسی بے وقوف سے پوچھو گے تو وہ بھی بتا دے گا۔''
پہلا بچہ: ''اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔'' (فاطمہ نور، شیخوپورہ)

ایک بچہ درخت کے ساتھ اُلٹا لٹکا ہوا تھا۔ دادی نے پوچھا: ''بیٹا! درخت کے ساتھ اُلٹے کیوں لٹکے ہو۔'' بچے نے جواب دیا۔ ''دادی سر درد کی گولی کھائی تھی، کہیں پیٹ میں نہ چلی جائے۔''

ایک دن تین دوستوں نے پکنک کا پروگرام طے کیا۔ پہلا بولا: ''میں آم کا ٹوکرا لاؤں گا۔'' دوسرا بولا: ''میں بریانی پکوا کر لاؤں گا۔'' تیسرا بولا۔ ''میں اپنے چھوٹے بھائی کو لاؤں گا۔'' (مومنہ عامر، لاہور)

جج (ملزم سے): ''تم نے اس شخص کو تھپڑ کیوں مارا؟''
ملزم: ''جناب اعلیٰ، اس نے مجھے پچھلے مہینے گینڈا کہا تھا۔''
جج: ''تو پچھلے مہینے کا غصہ کل کیوں نکالا؟''
ملزم: ''کیوں کہ میں نے کل ہی گینڈا دیکھا ہے۔'' (محمد صفی خان، پشاور)

باپ: ''ارے جاوید تم کیوں رو رہے ہو؟''
جاوید: ''ماسٹر صاحب نے مجھے سزا دی ہے۔''
باپ: ''کس بات پر؟''
جاوید: ''اس لیے کہ میں یہ نہیں بتا سکا کہ ہمالیہ کہاں ہے؟''
باپ: ''آئندہ سے خیال رکھو، جو چیز جہاں رکھو یاد کر لیا کرو اور پوچھنے پر فوراً بتا دیا کرو۔'' (محمد عمیس خان، ڈیرہ غازی خان)

اُستاد جماعت میں آئے تو کسی کی کتاب گری پڑی تھی۔ اُستاد غصے سے بولے۔ ''یہ کس کی کتاب ہے؟''
''مولانا حالی کی۔'' ایک لڑکے نے جواب دیا۔ (علینہ عامر، فیصل آباد)

مریض (ڈاکٹر سے): ''آپ اتنے عرصے سے میرے دانت نکال رہے ہیں اور ہر بار غلط دانت نکال دیتے ہیں۔''
ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا: ''آپ فکر نہ کریں آج درست دانت نکال دوں گا کیوں کہ آپ کا صرف ایک ہی دانت باقی ہے۔''
(آمنہ عامر، فیصل آباد)

اُستاد (شاگرد سے): ''بتاؤ انگریزوں نے جب برصغیر میں پہلا قدم رکھا تو پھر انہوں نے کیا کیا؟''
شاگرد: ''جناب انہوں نے دوسرا قدم رکھا۔'' (احمد عامر، فیصل آباد)

سفیان ایک ذہین پولیس افسر تھا۔ وہ دورانِ تفتیش ہر چیز کو گہرائی سے سوچتا تھا۔ یہ شدید سردیوں کا موسم تھا۔ اس کی تعیناتی کوئٹہ میں ہوئی تھی۔ سردیوں میں کوئٹہ میں شدید برف باری کا موسم ہوتا ہے۔ سفیان اپنے کمرے میں کام میں مصروف تھا۔ اچانک اسے اطلاع ملی کہ برف پوش پہاڑوں پر ایک مرد کی لاش پڑی ہے۔ سفیان نے فوراً اپنے ماتحت کو ساتھ لیا اور جائے واردات پر پہنچ گیا۔ سفیان نے دیکھا کہ کسی مرد کی لاش برف پر پڑی ہوئی ہے اور برف کے اوپر پاؤں کے نشانات کے ساتھ ساتھ دو لائنیں متوازی چل رہی ہیں۔

سفیان نے پاؤں اور لائنوں کو بہ غور دیکھا۔ کچھ دن بعد اس نے قاتل کا سراغ لگا لیا۔

پیارے بچو! آپ بتایئے سفیان نے قاتل کو کیسے تلاش کیا؟

ستمبر میں شائع ہونے والے ''کھوج لگایئے'' کا صحیح جواب ''ناریل'' ہے۔

ستمبر 2015ء کے کھوج لگایئے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- حافظ مہدیہ آصف، گوجرانوالہ
2- تسنیم عبدالمجید، راجہ جنگ
3- سعد زواد، پشاور
4- ارم اشرف، بھکر
5- عاشر علی کمبوہ، پھول نگر

نکلتی گرمیوں کی ایک سہانی شام تھی۔ آنگن میں پلنگ پڑے تھے۔ امی جان اور خالہ جان پڑوسنوں کے جھرمٹ میں بیٹھی حسب دستور تیری میری برائیاں کر رہی تھیں۔ سب کے منہ میں پان ٹھنسے تھے۔ ساتھ ہی سروتا بھی دھڑا دھڑ تانیں اُڑا رہا تھا۔

نارنگی کے پیڑ کے پاس ہم محلے کے بچوں کو ”عامل معمول“ کا تماشا دکھا رہے تھے۔ ہم ”عامل“ تھے اور ہماری خالہ زاد بہن سیما ”معمول“۔ ہم ابا جان کی کالی اچکن پہنے ہوئے تھے اور ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا۔ ہم نے ڈنڈا سیما کے منہ کے سامنے لہرایا اور بولے۔ ”کالی مائی کلکتے والی، تیرا وار نہ جائے خالی۔ چھو۔ چھو۔ چھو۔“ اور سیما جھوٹ موٹ بے ہوش ہو کر پلنگ پر گر پڑی۔ ہم نے اس کے اوپر چادر ڈال دی اور بچوں سے بولے۔ ”دیکھیے صاحبان!“ کیا ہی کنڈل مار کے بیٹھا ہے جوڑا سانپ کا۔ اب ہم آپ کو جادو کا کھیل دکھائیں گے مگر پہلے آپ سڑک چھوڑ کر چار قدم آگے آ جائیں۔ ایسا نہ ہو پولیس والا چالان کر دے۔ ٹھیک ہے، اب بچہ لوگ زور سے تالی بجائے۔

اور بچہ لوگ نے اتنے زور سے تالیاں بجائیں کہ امی جان چیخ کر بولیں۔ ”اے بیٹے! کبھی تو چین سے بیٹھا کر۔ توبہ ہے! سارا گھر سر پر اُٹھا رکھا ہے۔ موئی چھٹیاں کیا آتی ہیں، میری جان کو مصیبت آتی ہے۔“ یہ کہہ کر ایک پڑوسن کی طرف مڑیں اور بولیں۔ ”ہاں تو سروری، میں کیا کہہ رہی تھی؟ ارے ہاں! یاد آیا۔ اس موئے ماسٹر رحمت علی کا ذکر تھا۔ بہن اس کی شکل تو وہ ہے کہ ایتر کے گھر تیتر، باہر باندھوں کہ بھیتر۔ اوچھے آدمی کو خدا پیسا دیتا ہے تو وہ اتراتا پھرتا ہے......“

امی جان کی گاڑی نے پٹڑی بدلی تو ہم نے پھر کھیل شروع کر دیا۔ ”ہاں تو مہربان! دیکھیے۔ ہم نے اس لڑکی پر جادو کیا ہے۔ اب اس کا دماغ آئینے کے مانند ہو گیا ہے۔ ہم اس سے جو پوچھیں گا، یہ بالکل سچ سچ بتائیں گا۔“

یہ کہہ کر ہم سیما سے بولے۔ ”اے لکڑی...... آئی ایم سوری۔ اے لڑکی! بتا تُو کون؟“ سیما بولی۔ ”معمول۔“

ہم بولے۔ ”اور ہم کون؟“ بولی۔ ”نامعقول۔“

ہم نے اس کے پیر میں چٹکی لی تو چیخ کر بولی۔ ”عامل، عامل۔“

ہم نے کہا۔ ”شاباش! اب بتا، جو پوچھیں گا، بتائیں گا؟“

وہ ناک میں بولی۔ ”بتائیں گا۔“

ہم بولے۔ ”جو کھلائیں گا وہ کھائیں گا۔“

بولی۔ ”جوتے نہیں کھائیں گا، باقی سب کچھ کھائیں گا۔“

ہم بولے۔ ”کھانے سے پہلے یہ بتا کہ یہ لڑکا کون ہے؟“

بولی۔ ''آئی ایم سوری۔ آپ نے اتنی موٹی چادر اوڑھا دی ہے کہ ہم کو دکھائی نہیں دیتا۔ باریک چادر اوڑھایئے۔ پھر بتائیں گا۔''

سب بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ہم نے کھڑے ہو کر سر کھجایا اور سوچنے لگے، بات کس طرح بنائیں کہ ایک دم گڑبڑ مچ گئی۔

ہمارا چھوٹا بھائی مسعود کمرے میں سے بھاگتا ہوا آیا۔ خوف کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ آتے ہی چیخ مار کر پلنگ پر چڑھ گیا اور بولا ''گھک گھک گھک گھک۔'' تمام عورتیں گھبرا گئیں۔ امی دوڑی دوڑی آئیں اور بولیں۔ ''میرے لال! میری جان! ماں صدقے، ماں قربان! بتا تو سہی کیا ہوا؟''

مسعود میاں آنکھیں اور منہ دونوں پھاڑ کر بولے۔ ''گھک گھک گھک گھک۔''

امی سر پیٹ کر بولیں۔ ''ہے ہے! کسی آفت بلا سے ڈر گیا ہے۔ اللہ کی امان، پیروں کا سایہ، دوست شاد، دشمن ناشاد۔ نیکی کا بول بالا، بدی کا منہ کالا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم...... یٰسین والقرآن الحکیم......''

خالہ جان بولیں۔ ''اے آپا، ہوش کے ناخن لو۔ یاسین تو مرتے وقت پڑھتے ہیں۔'' مسعود کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ جب لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہ بتایا تو ہم نے لپک کر دو چپت رسید کیے۔ آپ منہ بسور کر بولے۔ ''مارتے کاہے کو ہو؟ کہہ تو رہے ہیں کہ اندر کمرے میں سانپ ہے، کرسی کے نیچے۔''

سانپ کا نام سن کر تمام عورتوں کو سانپ سونگھ گیا اور ہم بھی بغلیں جھانکنے لگے، مگر پھر ذرا ہمت کی اور گلا صاف کر کے بولے۔ ''مگر آپ کمرے میں کیوں گئے تھے؟''

مسعود صاحب بولے۔ ''ہم الماری میں سے بسکٹ نکال رہے تھے۔'' یہ کہہ کر آپ نے سر کھجایا اور جلدی سے بولے۔ بسکٹ تھوڑی نکال رہے تھے، ہم تو...... ہم تو...... کیا نام اس کا......'' بسکٹوں کا نام سنا تو امی سانپ کو تو گئیں بھول اور چیخ کر بولیں۔ ''گھر میں کوئی چیز آ جائے تو جب تک اسے کھا پی کر ختم نہ کر دیں یہ بچے تب تک مانتے تھوڑی ہیں۔ توبہ ہے! ایسے بچے بھی میں نے......''

خالہ جان بات کاٹ کر بولیں۔ ''اے آپا، بسکٹوں کو چھوڑو۔ سانپ کی فکر کرو۔''

امی گھبرا کر بولیں۔ ''ارے ہاں! جا تو سعید، بیٹھک میں سے ابا جان کو بلا لا۔ کہنا محلے کے آٹھ دس آدمیوں کو بھی ساتھ لیتے آئیں۔''

اور ہم جا ہی رہے تھے کہ ابا جان موٹا سا ڈنڈا لے کر اندر آ گئے۔ کسی بچے نے انہیں پہلے ہی سے خبر کر دی تھی۔ پیچھے چچا جان بھی تھے۔ آگے آگے یہ دونوں، ان کے پیچھے امی اور خالہ جان اور ان کے پیچھے ہم کمرے میں داخل ہوئے۔ دائیں طرف کونے میں الماری تھی اور اس کے پاس ہی ایک کرسی رکھی تھی۔ برآمدے میں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی اور اس دھندلی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ کرسی کے نیچے ایک پتلا سا کالا سیاہ ناگ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ ہمیں غش آنے کو تھا کہ ابا جان نے آگے بڑھ کر کمرے کی بتی جلا دی۔ سارا کمرا روشنی سے جگمگا اُٹھا۔ امی جان نے اپنا وظیفہ شروع کر دیا۔ ''اللہ کی امان۔ پیروں کا سایہ۔'' ابا جان لاٹھی ہاتھ میں پکڑے آہستہ آہستہ کرسی کی طرف بڑھے اور سانپ کو لاٹھی میں لپیٹ کر اوپر اٹھا لیا، مگر یہ کیسا سانپ تھا۔ نہ تو وہ تڑپا اور نہ اس نے بل کھایا۔ لاٹھی کے ساتھ اس طرح چلا آیا جیسے رسی ہو۔ ابا جان نے اسے ہاتھ میں پکڑ لیا اور بولے۔ ''لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو ازار بند ہے......!''

اب تو اتنے قہقہے پڑے کہ کان پڑی آواز نہ آئی۔ مسعود میاں جھینپ کر بولے۔ ''ہم نے دیکھا تھا تو یہ سانپ تھا۔ اب اس نے بھیس بدل لیا ہے۔'' اس ہڑبونگ میں رات کافی گزر گئی تھی۔ محلے کی عورتیں ایک ایک کر کے چلی گئیں اور ہم سب اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ امی نے زور کی جمائی لی اور بولیں۔ ''سعید میاں، تمہارے سرہانے تپائی پر میں نے پانی کا جگ اور گلاس رکھ دیا ہے۔ رات کو پیاس لگے تو مجھے مت اُٹھانا۔ ماشاءاللہ 12 سال کے ہو گئے ہو، ابھی تک ڈرتے ہو؟''

سیما کھوں کھوں کر کے ہنسی تو ہمیں بہت غصہ آیا۔ بولے: ''امی، میں ڈرتا تھوڑی ہوں۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ آپ کو بھی پیاس لگی ہوگی۔ جائیے! آج سے میں آپ کو نہیں اُٹھاؤں گا۔''

ابا جان بولے۔ ''میرا بیٹا بڑا بہادر ہے۔''

''اور کیا......'' ہم سینہ پھلا کر بولے۔ ''بڑا ہو کر میں تھانیدار بنوں گا اور سب سے پہلے سیما کو حوالات میں بند کروں گا۔''

سیما نے چادر تان لی اور بولی۔ ''تھانیدار نہیں تو جمعدار تو ضرور بنو گے۔'' یہ کہہ کر ہنسی اور آہستہ سے بولی۔ ''بھنگیوں کے۔''

ہم بھنا کر ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئے اور تڑخ کر بولے۔

"دیکھئے امی جان! اسے سمجھا لیجئے ورنہ۔"

ابا جان نے کہا۔ "بس اب پانی پت کی چوتھی لڑائی شروع ہو جائے گی۔ چلو سیما، تم شمال کی طرف منہ کرو اور سعید میاں، تم جنوب کی طرف۔ اب کوئی بولا تو اس کی خیر نہیں۔ شب بخیر!"

ہم نے جواب دیا۔ "شب بخیر!" اور آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ اور...... آدھی رات کو سوتے سوتے ایک دم چونک اُٹھے۔ بالکل چت لیٹے ہوئے تھے۔ چندا ماموں کی صاف اور چمکیلی روشنی میں، نیند کی ماتی، ادھ کھلی آنکھوں سے ہم نے دیکھا کہ ایک نہایت ہی کالی سیاہ، موٹی سی، لمبی سی، چمکیلی سی چیز ہمارے سینے پر رینگ رہی ہے۔ پہلے تو سوچا کہ یوں ہی پڑے رہیں، لیکن وہ چیز، وہ کالی سیاہ اور چمکیلی سی چیز دھیرے دھیرے گردن کی طرف آ رہی تھی۔ ہم نے زور سے نعرہ مارا مگر آواز حلق ہی میں اٹک کر رہ گئی۔ آخر بڑی مشکل سے ہمت کی اور ایک دم اس کالی سیاہ، چمکیلی اور موٹی سی چیز کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور زور سے بولے۔ "گھک گھک گھک گھک۔"

ہمارے پاس ہی امی جان اور خالہ جان کے پلنگ تھے اور کچھ دور ابا جان سو رہے تھے۔ تینوں گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ امی نے ہمیں سینے سے چمٹا لیا اور بولیں۔ "کیا ہوا، میرے بیٹے! کیا ہوا میرے لال!" ہم بتاتے کیا خاک۔ ڈر کے مارے ہوش و حواس گم تھے۔ بس گھک گھک گھک گھک کیے جا رہے تھے۔ امی جان نے فوراً اپنا وظیفہ شروع کر دیا۔ "اللہ کی امان، پیروں کا سایہ، دوست شاد، دشمن ناشاد......"

ابا جان نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "بولتا کیوں نہیں؟ آخر ہوا کیا؟ اور یہ سیما کی چٹیا کیوں پکڑ رکھی ہے؟ اسے تو چھوڑ۔" سب لوگ پریشان تھے مگر سیما منہ میں دوپٹا ٹھونسے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آخر یہ معاملہ کیا ہے؟" ابا جان جھلا کر بولے۔ "اس کے ہاتھ میں سیما کی چٹیا کیسے آئی؟ اور آئی تو اس نے شور کیوں مچایا؟ اور شور مچایا تو اب خاموش کیوں نہیں ہوتا؟"

سیما بولی۔ "خالو جان، میں بتاؤں؟ مگر پہلے بھائی جان کے ہاتھ سے میری چٹیا چھڑوا دیجئے۔ سخت درد ہو رہا ہے۔"

ابا جان نے ہماری مٹھیاں کھول کر اس کی چٹیا چھڑا دی۔ ہم ابھی تک آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے، ٹانگیں پھیلائے اور ہاتھ اُٹھائے اُلو کی طرح گھورے جا رہے تھے۔

سیما بولی۔ "بات یہ ہوئی خالو جان کہ مجھے لگی پیاس۔ میں پانی پینے کے لیے بھائی جان کے سرہانے آئی، گلاس میں پانی بھرا اور ان کی چارپائی پر بیٹھ کر پینے لگی۔ اتفاق سے میری چٹیا ان کے سینے پر پڑ گئی۔ یہ سمجھے کہ سانپ ہے اور لگے کرنے گھک گھک۔"
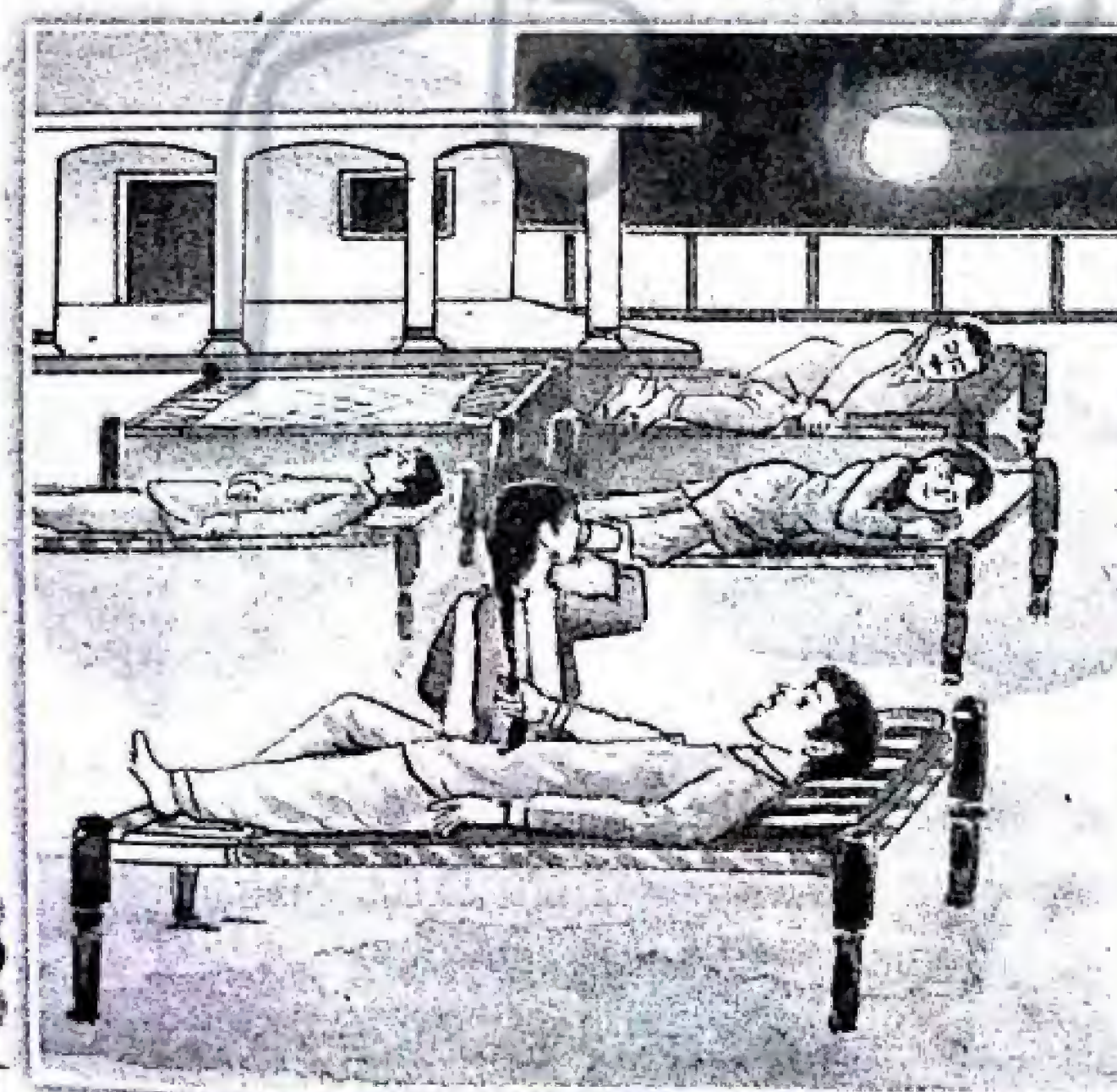
"لاحول ولاقوۃ......" ابا جان ہنسنے لگے۔

خالہ جان بولیں۔ "بیٹی، تیری چٹا بھی تو دس گز لمبی ہے۔ توبہ! ایسے بال بھی ہم نے کسی کے نہیں دیکھے۔ جا، اب جا کے سو جا۔"

صبح ہوئی تو ہم نے سیما کی خوشامد کی کہ اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ مگر توبہ! وہ سیما ہی کیا جو مان جائے۔ اس نے سارے محلے کو یہ بات بتا دی اور ہوتے ہوتے ہمارے اسکول کے لڑکوں کو بھی ہماری بہادری کا یہ قصہ معلوم ہو گیا اور کئی مہینوں تک ہم شرم سے سر جھکائے جھکائے پھرے۔ ☆☆☆

حماقتیں

محمد اسلم

پاکستان بننے کے پندرہ بیس سال بعد تک ملک میں تعلیم کا ذریعہ سرکاری ادارے تھے۔ پرائمری تک تعلیم میونسپل کمیٹیوں کے اسکول مہیا کرتے تھے اور مڈل اور ہائی اسکول کی تعلیم ضلعی انتظامیہ کے تحت چلنے والے اسکولوں میں حاصل کی جاتی تھی۔

میں نے پانچویں جماعت تک تعلیم محلے کے پرائمری اسکول میں حاصل کی۔ تعلیم کا سلیبس ملک کے طول و عرض میں ایک سا تھا اور ابتدائی جماعتوں میں اُردو، دینیات، حساب، جغرافیہ اور تاریخ پڑھائی جاتی تھی۔

مجھے پڑھائی کا شوق تھا لیکن نہ جانے کیوں میرا ذہن اتنا اچھا نہ تھا۔ باقی مضامین تو جیسے تیسے ہو رہے تھے، حساب میرے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔ تقریباً روزانہ حساب کے پیریڈ میں میری شامت آئی رہتی اور میں چھٹی کے بعد سوال نہ آنے پر آنکھوں میں آنسو لیے گھر لوٹتا۔

پرائمری پاس کرنے کے بعد چھٹی جماعت کے لیے ہائی اسکول میں داخلہ لیا تو حساب کے ساتھ ایک اور مرحلہ درپیش ہوا۔ اب باقی مضامین کے ساتھ انگریزی بھی شامل ہوگئی۔ یہ میرے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہوئی اور تقریباً چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی میں انگریزی کے حروف ابجد (A,B,C,D) ذہن نشین نہ کر سکا۔ تاہم سال کے ختم ہونے اور امتحانوں تک میں نے نہ صرف پورے حروف ابجد ذہن نشین کر لیے بلکہ دنوں، مہینوں اور موسموں کے نام بھی یاد کر لیے اور میں چھٹی جماعت پاس کر کے ساتویں میں چلا گیا۔

میں خوش تھا کہ میں نے انگریزی پر ”عبور“ حاصل کر لیا ہے لیکن نئی جماعت میں ایک اور مسئلہ، ایک سنگین تر مسئلہ، انگریزی کی گرامر کا، سامنے آن کھڑا ہوا۔ اب ہمیں انگریزی کی کتاب پڑھنے کے ساتھ فعل (verb) صفت (adjective) اور زمانوں (tenses) کی پہچان کرائی جانے لگی لیکن اس میں میرے لیے سب سے مشکل کام زمانہ ماضی (Past Tense) کے لیے فعل (verb) کی دوسری اور تیسری فارم ذہن نشین کرنے کا تھا۔

اسکول کے بعد گھر پر، ہوم ورک پر لگنے والا تقریباً آدھا وقت verb کی دوسری اور تیسری فارم رٹنے پر خرچ ہو جاتا اور دہرانے پر، پھر یہ ادھر اُدھر پھیل جاتے اور میں بے بسی اور لاچارگی کی تصویر بن کر رہ جاتا۔ نتیجتاً میرا آدھا خون حساب کے پیریڈ میں خشک ہو جاتا اور باقی کا نصف انگریزی کے پیریڈ میں۔ جوں ہی انگریزی

کے ماسٹر صاحب کلاس میں آتے ہیں حفظ کی ہوئی تمام دعاؤں کا ورد کرنے لگتا لیکن تا بکے۔

ایک روز وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ماسٹر صاحب نے آتے ہی verb کی دوسری اور تیسری فارم پوچھنا شروع کر دی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے یہ کام بائیں طرف سے شروع کیا اور میرا ڈیسک سب سے آخر میں دائیں طرف آتا تھا۔ یوں مجھے کچھ یاد کرنے کا موقع مل گیا۔

ماسٹر صاحب نے ایک اور مہربانی یہ بھی فرمائی کہ verb کا چناؤ لڑکوں پر چھوڑ دیا لیکن شرط یہ تھی کہ ہر لڑکا ایک نئے verb کی دوسری تیسری فارم بتائے گا، پہلے سے بتائے ہوئے کی نہیں۔

پہلے تو میں آخری ڈیسک پر بیٹھنے کی خوشی منا رہا تھا لیکن اب مجھے اس کے نقصان کا بھی اندازہ ہوا کہ مجھے جتنے verbs کی دوسری تیسری فارمز آتی تھیں وہ سب مجھ سے پہلے بیٹھے لڑکے بتاتے جا رہے تھے۔ یا اللہ میرا کیا ہوگا؟

اب میں پیریڈ ختم ہونے کی دعائیں کرنے لگا لیکن یہ ختم ہونے کو نہ آ رہا تھا اور میری باری قریب آ رہی تھی۔ میرے پسینے چھوٹنے لگے۔

میرے ڈیسک سے پہلے ڈیسک پر بیٹھے افضل اور ندیم کی باری آئی تو مجھے لگا کہ میرا دل سینے سے باہر آ جائے گا۔ عین اسی وقت میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں کلاس کا آخری لڑکا تھا اور میرے ساتھ صفدر بیٹھا تھا جو مجھ سے بھی زیادہ نالائق تھا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ باری آنے پر وہ اعتماد سے اٹھا اور اس نے Good, Gooder, Goodest کہا۔ ساری کلاس میں قہقہوں کا ایک طوفان اُٹھا۔ میں نظریں نیچی کیے اپنی چال پر اترا رہا تھا۔ ہنسی اور ہونگ کا طوفان تھا تو باری آنے پر میں نے Good, Better, Best کہہ کر کلاس پر یوں نظر دوڑائی جیسے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو۔

کلاس میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ماسٹر صاحب آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہمارے ڈیسک تک آئے۔ انہوں نے دو ڈنڈے صفدر کو لگانے کے بعد مجھے ڈنڈے کھانے کے لیے ہاتھ آگے کرنے کو کہا۔ ڈنڈے مجھے بھی پڑے کیوں کہ میں نے بھی verb کی دوسری تیسری فارم بتانے کی بجائے adjective کی comparative اور superlative فارم بتائی تھی۔ یعنی سوال گندم جواب جو۔ پٹائی تو ہونی تھی۔

☆......

پنجابی کی ایک مثل کا اُردو میں ترجمہ کچھ یوں ہے کہ شوق یا مشغلے کے لیے اس پر آنے والا خرچہ بے معنی ہے۔ یعنی آپ کے دل میں کسی چیز کی خواہش یا شوق آپ کی جیب سے مطابقت رکھے، یہ ضروری نہیں۔

ایسا ہی کچھ معاملہ میرے ساتھ بچپن میں ہوا۔ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ جہاں دو وقت کی روٹی بمشکل ہوتی تھی لیکن مجھے شوق ہوا تو فوٹو گرافی جیسے مہنگے مشغلے کا۔ اس شوق میں میرے محلے کے دو دوست اور میرے ہم جماعت ارشد اور حامد بھی شامل تھے۔ فوٹو گرافی کے لیے پہلی ضرورت ایک کیمرے کی تھی اور ان وقتوں میں سب سے سستا کیمرہ پچاس روپے میں آتا تھا جو آج کے تقریباً دو ہزار روپے کے برابر تھا اور چوں کہ اتنی بڑی رقم ہمارے بس میں نہ تھی، میں اپنے شوق کو سینے میں دبائے کسی معجزے کا انتظار کرنے لگا۔

اور پھر یہ معجزہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد میں اپنے ایک عزیز کے گھر گیا تو مجھے ایک ڈبہ نما چوکور کیمرہ کوڈک نظر آیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اپنے شوق کا اظہار کر دیا۔ میرے عزیز نے کمال مہربانی سے مجھے وہ کیمرہ کچھ عرصے کے لیے دے دیا اور یوں مجھے اپنا دیرینہ شوق پورا کرنے کا موقع مل گیا۔

واپس گھر پہنچ کر میں نے وہ کیمرہ اپنے دونوں دوستوں کو دکھایا تو وہ بھی خوش ہوئے اور ہم نے پہلی فرصت میں اسے استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا لیکن اس کو استعمال کرنے کے لیے اس میں فلم لوڈ (load) کرانی تھی جس کی قیمت غالباً تین روپے تھی۔ ہم تینوں دوستوں نے جھوٹے سچے بہانوں سے اپنے اپنے گھروں سے یہ رقم اکٹھی کی اور فوٹو گرافر کی دکان سے کیمرہ لوڈ کرا لیا۔ کیمرہ لوڈ کرنے کے بعد فوٹو گرافر نے ہمیں بتایا کہ فلم میں سولہ

تصویریں تھیں اور جب یہ تعداد پوری ہو جائے تو ہم یہ فلم اس کے پاس لائیں گے تاکہ وہ اس کو دھو کر تصویریں نکال سکے۔

اتفاق سے اگلا دن اسکول سے چھٹی، یعنی اتوار کا تھا اور ہم نے وہ رات بہت بے چینی سے کاٹی کہ کب صبح ہو اور ہم اپنے شوق کی تکمیل کریں۔

اگلی صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ہم تینوں دوست لوڈڈ کیمرہ کندھے سے لٹکائے، محلے کے جنوب میں کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ گرمیوں کا موسم تھا اور فضا میں حبس تھا لیکن ہمارے شوق نے اس موسم کو بھی ہمارے لیے خوش گوار بنا دیا تھا۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا جوہڑ تھا جس میں چھوٹے بڑے مینڈک تیرتے رہتے تھے۔ ہمیں یہ جوہڑ بڑا رومانٹک لگا اور ہم نے اس کے کنارے کھڑے ہو کر فوٹو گرافی کی ابتدا کرنے کی ٹھانی۔ سب سے پہلے میں جوہڑ کے کنارے بیٹھا اور مخالف سمت والے کنارے سے ارشد نے میری تصویر اُتاری۔ اس کے بعد حامد کی باری تھی لیکن جب ارشد کی باری آئی تو وہ کنارے پر لڑکھڑا گیا اور جوہڑ میں جا گرا۔ اسے مشکلوں سے باہر نکالا کیوں کہ وہاں کافی پھسلن تھی اور وہ بار بار جوہڑ میں پھسل جاتا تھا۔ اللہ اللہ کر کے وہ کنارے تک آیا۔ اس کا پاجامہ کیچڑ میں لت پت ہو چکا تھا لیکن وہ فوٹو کھچوانے پر مصر تھا۔ میں نے اس کی ''فرمائش'' کے مطابق ایک اور زاویے (اینگل) سے اس کی تصویر لی اور باقی تیرہ تصویریں کھینچنے کے لیے ہم آگے بڑھے۔

کچھ فاصلے پر سڑک تھی۔ وہاں ہمیں بھیڑ بکریوں کا ریوڑ ملا۔ ہم نے چرواہے کو کچھ دیر کے لیے اپنا ریوڑ روکنے کے لیے کہا تو وہ اس شرط پر راضی ہوا کہ ریوڑ کے ساتھ اس کی تصویر بھی لی جائے۔ ہم نے اس کی یہ شرط مانتے ہوئے تین چار تصویریں اُتاریں اور باقی کی آٹھ نو تصویریں اتارنے کے لیے کچھ فاصلے پر ایک آموں کے باغ کی طرف چلے۔

آموں کے باغ میں پہنچ کر ہم نے باغ کے رکھوالے سے اجازت مانگی تو وہ اس اندیشے کے تحت کہ کہیں ہم فوٹو گرافی کے بہانے آم نہ توڑیں، پس و پیش کرنے لگے۔ اس کو آم نہ چرانے کی یقین دہانی کرانے میں کافی منت سماجت کرنی پڑی۔ آخر وہ راضی ہوا تو ہم نے مختلف آم کے درختوں کے ساتھ کھڑے ہو کر چھ، سات تصویریں اُتار ڈالیں۔

آموں کے باغ کے باہر آئے تو ہمارے کیمرے میں ابھی تین چار تصویریں باقی تھیں لیکن ہمیں گھروں سے نکلے ہوئے دو تین گھنٹے گزر چکے تھے اور ہمیں بھوک کے ساتھ ساتھ گھر والوں کی ڈانٹ کی فکر بھی ستائے جا رہی تھی۔

سو ہم نے واپسی کی ٹھانی اور باقی کی تین چار تصویریں سڑک پر آنے جانے والے لوگوں کی کھینچ کر فلم پوری کر لی۔ اس کے بعد طے یہ پایا کہ کیمرہ حامد کے پاس رہے گا اور وہ اگلے دن بائیسکل پر فوٹو گرافر کی دکان پر فلم دھونے کے لیے دے آئے گا۔

وہ رات ہماری مزید بے چینی میں گزری کیوں کہ ہم اپنی تصویریں دیکھنے کے لیے بے تاب ہوئے جاتے تھے۔

اگلی صبح دروازے پہ دستک ہوئی۔ باہر آیا تو حامد منہ لٹکائے ملا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ دیکھو۔ ہمیں فلم ہی غلط دی گئی ہے۔'' اور اس نے کرتے کی سائیڈ پاکٹ سے گچھم گچھا ہوئی فلم نکال کر مجھے دکھائی۔ وہ ہم تینوں سے بے صبرا نکلا اور ''دھلائی'' کے پیسے بچانے کے لیے اس نے اسے نلکے (ہینڈ پمپ) پر دھو ڈالا تھا۔ ☆☆☆
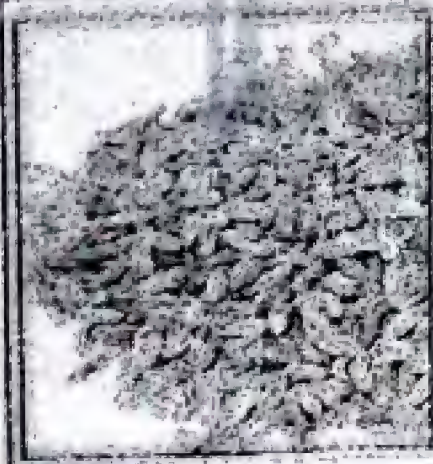
سونف (Aniseed) ایک قسم کا دوائی پودا، جس کی اونچائی 2 سے 4 فٹ تک ہوتی ہے۔ پتے سویوں کی طرح چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ پھول مرکب قسم کے چھاتا نما خوشوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ پھولوں کا رنگ زرد اور پنکھڑیوں کے سرے اندر کی طرف مڑے ہوتے ہیں۔ جنوبی یورپ کی پیداوار ہے لیکن اب انگلستان اور یوریشیا کے معتدل خطوں میں بھی کاشت کیا جاتا ہے۔ کاشت شدہ پودے کا پھل خوش بودار اور اس کا ذائقہ خوش گوار ہوتا ہے۔ اس کا عرق ہاضمے کے لیے مفید ہے۔ نرم نرم کونپلیں کھائی جاتی ہیں اور پھل (سونف) کھانوں کو خوش ذائقہ بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس پودے کی ایک قسم (Ferula Communis) بحیرہ روم کے خطے کی پیداوار ہے جہاں اس کے تنے کی لکڑی بھی کام میں لائی جاتی ہے۔

بے نور

لامیہ منیر اعوان

چوہدری سریاب، گوٹھ سردار پور کا ایک بڑا سردار اور زمین دار تھا۔ شادی ہوئی تو بڑے عرصے بعد اللہ نے اندھیرے گھر کا چراغ، ایک بیٹا عطا کیا۔ وہ واجبی سی شکل وصورت کا تھا تو اکلوتا ہی اور وہ بھی اتنی منتوں مرادوں کے بعد ملا تھا۔ کبھی سردار جی کی بیگم منزہ پیدل چل کر بری امام کے مزار پہ چادریں چڑھا کر آتی تو کبھی سردار جی خود جا کر موہڑہ شریف پر نیازیں بانٹ کر آتے۔ یہ تمام رسوم ان کے گاؤں میں نسل در نسل چلتی آ رہی تھیں۔ فرزند کی پیدائش کے بعد ان چیزوں پر ان کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ بہرحال اس کی پیدائش پر مسلسل چالیس دن گاؤں میں شام کے وقت بتاشے بانٹے جاتے اور سو لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا۔ بچے کا نام 'حمیر سریاب' رکھا گیا۔ بچہ ذرا سا کھانستا بھی تو ڈاکٹروں کی فوج ظفر موج چلی آتی۔ ہر قسم کی آسائش دے رکھی تھی۔ بتیس دانتوں میں سے نکلی ہوئی ہر خواہش پوری کر دی جاتی۔ ان حالات میں رہتے ہوئے موصوف کا بگڑ جانا روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ چھ سال کی عمر میں اسکول داخل کروایا گیا۔ عمدہ قسم کی یونی فارم بنوائی گئی۔ پہلے دن نہایت ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ لش پش کرتی کار میں بیٹھ کر اسکول پہنچے تو تمام بچے حیرت و حسرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگے۔ ان کے لیے اسپیشل کرسی منگوائی گئی۔ سارا دن جناب کرسی پر گردن اکڑائے بیٹھے رہے حالاں کہ باقی سب بچے زمین پر بچھے میلے ٹاٹ پر بیٹھے تھے۔ امیر باپ کی اولاد تھا لہٰذا اساتذہ نے اس کی بدتمیزیوں اور گستاخیوں کو نظرانداز کرنے میں ہی عافیت جانی۔ اگر کوئی استاد گھر کا کام نہ کر کے لانے پر ڈانٹتا بھی تو اس کو سبق سکھانے کے لیے نوکری سے ہٹوا دیا جاتا یا پھر اس کا تبادلہ ایسی جگہ کروا دیا جاتا کہ وہ عمر بھر یاد رکھتا۔

ان حالات میں رہتے ہوئے حمیر کا آٹھویں کے بعد ہی پڑھائی سے دل اچاٹ ہو گیا، لہٰذا اس نے ضد شروع کر دی کہ اس نے اسکول نہیں جانا۔ بہت منت سماجت اور لاڈ پیار کر کے اسے شہر کے بڑے اسکول میں داخلے کے لیے رضامند کیا اور وہ بھی اس شرط پر کہ معقول جیب خرچ کے ساتھ ساتھ نیا موبائل فون اور گاڑی بھی لے کر دی جائے گی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق، باپ کو اپنے لاڈلے کی خواہش پوری کرنی پڑی۔ قریب کے ایک ہوسٹل میں رہائش کا بندوبست کر دیا گیا۔

سفارش اور ڈھیر سارے پیسے لے کر حمیر اور چوہدری صاحب شہر کے اسکول پہنچے تو اسے فوراً داخلہ مل گیا۔ گاؤں میں تو پھر گھر والوں کا خوف تھا مگر شہر آ کر تو اس کو کھلی چھٹی مل گئی تھی، لہٰذا مہینے میں کبھی کبھار ہی اسکول کا رُخ کرتا۔ ستم بالائے ستم دوست بھی ویسے ہی نکلے جیسا کہ وہ خود تھا۔ خوشامد کر کر کے اس سے پیسے بٹورتے

اور مفت میں اس کی گاڑی میں بیٹھ کر سیریں کرتے پھرتے۔ اس طرح پڑھتے ہوئے فیل ہو جانا کچھ عجب نہ تھا۔ دوست تو اس کے فیل ہونے سے بال بال بچے مگر موصوف خود سپلی لے کر گھر واپس آ گئے۔ باپ نے کچھ کہنا چاہا مگر ماں سیسہ پلائی دیوار بن گئی۔ تھوڑی سی بے عزتی کے بعد اس کو "چھٹی" مل گئی۔ فیل ہونے سے اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اس لیے اس نے آگے پڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ والدین کو بھی اس کی حالتِ زار کا اندازہ ہو گیا تھا، لہٰذا مزید اصرار کرنا انہوں نے مناسب نہ سمجھا۔

چند سال تو حمیر میاں نے خوب مزے سے گزارے مگر پھر ایک دن تو قیامت ٹوٹ پڑی۔ بڑے مزے سے نرم گرم لحاف میں بیٹھے ڈرائی فروٹ کے مزے لے رہے تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی اور اس کے موڈ کا ستیاناس کر گئی۔ اماں ابا تو کسی کام سے شہر گئے ہوئے تھے۔ اس نے ملازم کو آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ گھنٹی دوبارہ بجی تو غصے میں بڑبڑاتے ہوئے وہ اُٹھا اور ریسیور کان پر لگایا۔ دوسری طرف کوئی خاتون کہہ رہی تھیں کہ اس کے والدین کا شہر سے واپسی پر ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی اس کی دل خراش چیخ بلند ہوئی اور وہ وہیں ڈھے گیا۔ تمام نوکر چاکر بھاگے بھاگے اس کے کمرے میں پہنچے تو یہ منظر دیکھ کر گھبرا گئے اور اس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے کہ ایسے میں ایک نوکر کی نظر ٹیلی فون پر پڑی۔ اس نے ریسیور اُٹھا کر کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ دوبارہ گھنٹی بج اُٹھی۔ فون سننے پر پتا چلا کہ دونوں لاشیں اسپتال منتقل کر دی گئی ہیں۔ نوکر چاکر بھی یہ سن کر رنجیدہ ہو گئے۔ اس کے چچا کو فون ملایا گیا اور انہیں تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا۔

اس کے چچا فوراً اسپتال پہنچے اور ان کی لاشیں گھر لائی گئیں۔ حمیر کا رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔ جنازے میں موجود ہر آنکھ اشک بار تھی۔ جب تک مہمان گھر میں موجود تھے تو سب ٹھیک رہا مگر کچھ دنوں بعد اس کے چچا اور چچی نے اپنے چہروں سے جھوٹی ہمدردی کا نقاب اُتار پھینکا اور اس کے لیے روایتی چچا، چچی ثابت ہوئے۔

حمیر کو بُری طرح ڈرایا دھمکایا گیا کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کی خیر نہیں۔ وہ کون سا اتنا سمجھ دار تھا کہ ان کو منہ توڑ جواب دے پاتا، لہٰذا وہ فوراً ڈر گیا۔ اس نے اپنے تھوڑے سے کپڑے اُٹھائے اور اپنا آئی فون اُٹھایا جو کہ اسے اٹھارہویں سالگرہ پر تحفتاً ملا تھا۔ اس نے یہ کام نہایت احتیاط سے کیا کیوں کہ اگر اس کے چچا کو یہ پتا چل جاتا تو اس کو اپنے موبائل سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے۔

یہ تمام سامان ایک گٹھڑی میں باندھ کر وہ باہر نکل پڑا۔ اس نے اپنے دوستوں کو تمام صورتِ حال سے فون پر آگاہ کیا مگر کوئی بھی اس کی مدد کو آگے نہ بڑھا۔ وہ خوشامدی مرغے جو سارا سارا دن اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے اور جن کی دوستی پر اسے فخر تھا، آج وہی دوست اس کے لیے انجان بن گئے تھے۔ وہ بہت افسردہ اور رنجیدہ تھا۔ ماں باپ کی اچانک موت، پھر اپنے سگے چچا کے گھر سے دھتکارے جانا اور پھر دوستوں کی بے وفائی...... سب کچھ بہت تکلیف دہ تھا۔

وہ کوئی چھوٹا بچہ نہیں تھا کہ کوئی اس کی مدد کو آگے بڑھتا، وہ تو انیس بیس سال کا نوجوان تھا اور وہ بھی ہٹا کٹا۔ جب دن ڈھلنے لگا تو اس کو بھوک محسوس ہوئی۔ وہ صبح کا بھوکا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے موبائل کو توڑ ڈالے جو اس کے کچھ کام نہ آیا تھا مگر اس کے علاوہ اس کے پاس تھا بھی کیا؟ اس نے اپنی جیبیں کھنگالی ان میں سے پچاس روپے برآمد ہوئے۔ اس وقت اسے وہ پچاس روپے بھی غنیمت معلوم ہو رہے تھے۔ وہ تیز تیز قدم بڑھانے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک ڈھابے پر کھڑا تھا۔ اس نے دو روٹیوں اور ایک پلیٹ دال کا آرڈر دیا۔ چند ہی منٹوں بعد کھانا آ گیا۔

کہاں وہ فائیو اسٹار ہوٹلوں کا کھانا اور کہاں وہ پتلی مرچیلی دال مگر اس وقت اسے وہ دال میکڈونلڈ کے برگر سے ہزار درجہ اچھی لگ رہی تھی۔ کھانا کھا کر وہ ڈھابے سے باہر آ گیا اور قریب ہی بنے ایک فٹ پاتھ پر لیٹ گیا جہاں چند بے گھر لوگ زمانے کی سختیوں سے بے پرواہ، نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ وہ بھی ایک چادر بچھا کر ادھر لیٹ گیا۔

حمیر کے ذہن میں خیالوں کا ایک ہجوم برپا تھا۔ اس کو وہ وقت بُری طرح یاد آ رہا تھا جب وہ پانچ پانچ لاکھ کے چنیوٹی پلنگ پر لیٹتا تھا اور اب وہ سیمنٹ کے فٹ پاتھ پر پڑا تھا۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کب وہ نیند کی وادی میں کھو گیا۔ صبح کے وقت جب اس کے قریب سے ایک لش پش کرتی کار گزاری تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کو بھی اپنا وقت یاد آ گیا جب وہ اپنے دوستوں کو گاڑی میں بٹھا کر سیریں کرواتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ اپنی گٹھڑی اُٹھا کر چل دیا۔

ابھی وہ کچھ ہی دُور گیا تھا کہ اسے سورج کی روشنی میں چمکتا مینار نظر آیا۔ وہ چلتا ہوا مسجد تک آیا اور جوتے اُتار کر وضو خانہ تک گیا اور اچھے طریقے سے وضو کر کے نماز ادا کرنے لگا۔ نماز کے

دوران حمیر سراپا خوب گڑگڑایا اور اللہ کے حضور اس نے رو رو کر معافی مانگی۔ نماز کے بعد اس نے دو نوافل اپنے والدین کے ایصالِ ثواب کے لیے ادا کیے۔ وہ پہلی مرتبہ خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ کے حضور پیش ہوا تھا ورنہ تو وہ صرف عید، بقرعید کے موقع پر ہی مسجد کا رُخ کرتا تھا۔ اپنے دل کے محرم کے ساتھ غم بانٹ کر وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

نماز ادا کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ چلو امام مسجد سے مل لیا جائے۔ وہ اُٹھا اور مولوی صاحب کے کمرے تک آیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے تلاوتِ قرآن کی آواز آ رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک اُدھر کھڑا رہا تھا کہ ایک دم سے مولوی صاحب کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور انہوں نے سر اُٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ حمیر انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا کیوں کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کے وہ ماسٹر صاحب تھے جن کو اس کے والد نے صرف اس لیے نوکری سے ہٹوایا تھا کہ انہوں نے اس کے لاڈلے کو ذرا سا ڈانٹ دیا تھا۔ ماسٹر جی خود بھی اس کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ قسمت ایک بار پھر انہیں آمنے سامنے لا کھڑا کرے گی۔ حمیر فوراً ان کے قدموں میں آ بیٹھا اور ان سے رو رو کر معافی مانگنے لگا۔ ماسٹر صاحب نے اسے سچے دل سے معاف کر دیا اور اس سے دریافت کیا کہ وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے؟ جواباً اس نے ماسٹر جی کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس کی بپتا سن کر وہ بھی آبدیدہ ہو گئے اور اسے تسلی دینے لگے۔

وہ اس کو اپنے گھر لے گئے جو کہ ان کو سرکاری طور پر ملا تھا کیوں کہ وہ ایک سرکاری مسجد میں اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ان کے گھر پہنچ گئے۔

گھر کیا تھا، بس ایک چھوٹا سا کمرا، کچن اور باتھ روم پر مشتمل ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ سرکار کی طرف سے ان کو تھوڑا بہت ماہانہ وظیفہ مل جاتا تھا جو ان کے لیے کافی تھا کیوں کہ نہ ہی ان کی کوئی اولاد تھی جب کہ اہلیہ بہت عرصہ پہلے ہی وفات پا چکی تھیں۔

ماسٹر صاحب نے اس کو کھانا کھلایا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے ان کو اپنا موبائل فون دکھایا جو وہ بیچنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ان کو اپنی کلائی پر پہنا ہوا پلاٹینم بینڈ دکھایا جس کے اوپر پلاٹینم کی باریک تاروں سے 'حمیر' لکھا ہوا تھا۔ یہ اس کو فٹ بال میچ جیتنے پر اپنی ماں کی طرف سے تحفتاً ملا تھا۔ ماسٹر جی شام کو اسے بازار لے گئے۔ خوش قسمتی سے اس کا موبائل تیس ہزار میں جب کہ

پلاٹینم بینڈ پندرہ ہزار میں بک گیا۔ یوں اس کے پاس 45 ہزار روپے ہو گئے۔ گھر واپس آتے آتے عشاء ہونے کو آئی۔ وہ فوراً رقم رکھ کر مسجد آ گئے۔ ماسٹر جی نے نماز پڑھائی اور حمیر نے ان کی امامت میں نماز ادا کی۔ اس کے بعد انہوں نے قرآنِ پاک کی تلاوت کی اور گھر آ کر سو گئے۔

تہجد کے وقت وہ پھر بیدار ہو کر مسجد پہنچے اور نماز ادا کی۔ تقریباً گھنٹے بعد وہ واپس کوارٹر آ پہنچے۔ اس نے ماسٹر جی سے پوچھا کہ وہ اس رقم کو کیسے استعمال میں لائے کیوں کہ بیٹھ کر کھانے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جو بات اس کو بہت پہلے سمجھ جانی چاہیے تھی، وہ اس کی عقل میں اب آئی تھی۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ بولے کہ وہ ایک چھوٹی سی دُکان کھول لے جس میں بچوں کے کھانے والی گولیاں، ٹافیاں، پاپڑ بسکٹ اور دیگر اشیاء ہوں۔ ماسٹر جی نے حج پر جانے کے لیے کافی رقم اکٹھی کی ہوئی تھی۔ انہوں نے وہ تمام جمع پونجی بھی اس کے حوالے کر دی۔ اب کل ملا کر ان کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے تھے۔ وہ ماسٹر صاحب کا بے حد مشکور تھا۔

قریب ہی ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی دُکان برائے فروخت تھی۔ انہوں نے دُکان کے مالک سے رابطہ کیا اور اس سے ملاقات کی۔ مالک، جس کا نام عباس تھا، ڈیڑھ لاکھ میں دُکان بیچ رہا تھا مگر ان کی مجبوری سن کر سوا لاکھ میں راضی ہو گیا۔ اس روز تو وہ رقم ساتھ نہیں لائے تھے، لہٰذا انیس تاریخ کو پیسے دینے کا وعدہ کر کے وہ واپس آ گئے۔ ماسٹر جی نے انیس تاریخ کو ایک نکاح پڑھوانے جانا تھا، لہٰذا وہ اس کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے۔ اب اس کو اکیلے ہی عباس کے پاس جانا تھا۔ شام کے وقت وہ رقم دینے کے لیے چل پڑا۔ اس نے رقم نہایت احتیاط سے رکھی ہوئی تھی۔ وہ خراماں خراماں چل رہا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی مسلسل اس کی نگرانی کر رہا ہے۔

ابھی وہ تھوڑا آگے ہی گیا تھا کہ کہیں سے دو ملنگ قسم کے آدمی اس کے پاس آئے۔ لمبے لمبے سلک کے چغے پہنے ہوئے، گلے میں لمبی لمبی مالائیں لٹکائے ہوئے، وہ دونوں خاصے بھیانک لگ رہے تھے۔ ایک بابا بولنے لگا: ''بچہ ہمیں معلوم ہے کہ تو مصیبتوں کا ستایا ہوا ہے اور تیرے پاس جو رقم ہے وہ بہت تھوڑی ہے۔'' حمیر تو بابا جی کا 'نالج' دیکھ کر حیران رہ گیا اور نہایت معصومیت سے کہنے لگا: ''اچھا، اگر آپ کو یہ سب پتا ہے تو پھر یہ بھی معلوم ہو گا کہ میرے والدین بھی فوت ہو چکے ہیں۔''

بابا جی کہنے لگے: ''ہاں بچہ ہاں! بابا سب جانتا ہے اسی لیے تو تیری مدد کو آیا ہے۔''

حمیر میاں تو بچپن سے ہی پیروں فقیروں کے پاس جاتا رہا تھا لہٰذا وہ ان نوسربازوں کی 'کاملیت' پر ایمان لے آیا تھا۔ پھر بابا کہنے لگا کہ اگر وہ اپنے والدین سے ملاقات کرنا چاہتا ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے دس منٹ تک بالکل ساکن کھڑا رہے تو وہ ''دوسرے جہان'' پہنچ جائے گا اور جب تک وہ اپنے والدین سے ملاقات کرے گا، پیچھے سے بابا صاحب اس کے پیسے دُگنے کر دیں گے۔

وہ بآسانی مان گیا۔ وہ تو گاؤں کے اسکول کا 'آٹھ جماعتیں فیل' تھا، بھلا اس اَن پڑھ، جاہل کو کیا معلوم تھا کہ کوئی عام آدمی اس کو ایسی جگہ کیسے لے جا سکتا تھا مگر اس وقت اس کو کون سمجھانے آتا۔ اس نے فوراً اپنے پیسے بابا لوگوں کے حوالے کیے اور آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہر شخص اسے دیکھ کر ہنس رہا تھا مگر وہ تو کسی اور ہی دُنیا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

کافی دیر تک وہ یوں ہی کھڑا رہا۔ بالآخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا مگر اسے وہ دونوں ملنگ نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا کہ اسے ایک شخص نظر آیا۔ اس نے اس آدمی کو ساری بات بتائی تو وہ بے اختیار ہنسنے لگا اور کہنے لگا کہ ''ارے بھولے بادشاہ! لگتا ہے پہلی بار گھر سے نکلے ہو یا مکتب سے اتنا بھی نہیں سیکھا کہ کھوٹے کھرے کی تمیز کر سکو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ سڑکوں پر ایسے ٹھگ تم جیسے ہی بے وقوف لوگوں کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے تو نہایت حیرت ہو رہی ہے۔ بہرحال اب جو خدا کو منظور تمہاری کم علمی ہی تمہارے آگے آئی ہے، لہٰذا گھر کا رستہ ناپو اور آئندہ احتیاط کرنا۔''

اس کی دُنیا ایک بار پھر اندھیر ہو گئی تھی۔ وہ دونوں نوسرباز اس کا سب کچھ لے گئے تھے مگر اسے یہ احساس دلا گئے تھے کہ اس کے بچپن کی محرومی جس کا ذمے دار وہ بذاتِ خود تھا، آج اس کے سامنے آ گئی تھی۔ کاش وہ علم اور تجربے کی راہ اپناتا تو آج اس مقام پہ نہ ہوتا۔

اب وہ پھر اپنا سر پکڑے فٹ پاتھ پر بیٹھا تھا۔ وہ علم کے نور سے بآسانی استفادہ حاصل کر سکتا تھا مگر وہ بے نور ہی رہا۔

☆☆☆

آپ بھی لکھیے

مجھے لہرانے والے

(ایمان یاسر، سیالکوٹ)

آج پھر وہ لڑکا اپنے گھر سے نکلا، اسی کام کے ارادے سے جو وہ روز کرتا تھا۔ صبح صبح اپنے محلے کی ایک دُکان پر جاتا اور پھر وہی پُرانا کام جو اس کی عمر کے کئی اور لڑکے کرتے تھے۔ میں روز اسی لڑکے کے گھر کی چھت سے یہ سب دیکھتا ہوں۔ کل رات اس کا باپ اسے کم پیسے لانے کی وجہ سے ڈانٹ رہا تھا۔ اسے تو رات کا کھانا بھی نہ ملا اور وہ سخت سردی میں چھت پر سویا تھا۔ میں ساری رات اسے دیکھتا رہا، اسے پکارتا رہا مگر وہ تو آسمان پر ستاروں کو ہی دیکھتا رہا۔

ایک تقریب میں مجھے لہرایا تھا، لیکن پھر بھی...... میں نے ان کا اسکول دیکھا۔ یقیناً ان کے ماں باپ کی ساری کمائی ان کو پڑھانے میں ہی خرچ ہو جاتی ہوگی۔ میں روز سوچتا لیکن کچھ دن پہلے میری سوچ بدل گئی تھی جب میں نے دفتر میں بیٹھے ان کے والدین کو دیکھا۔ انہوں نے مجھے اپنی میز پر رکھا ہوا ہے لیکن وہ مجھے کبھی نہیں دیکھتے۔ وہ تو شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ وہ لوگ تو ناجائز کمائی سے اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔

کچھ ہی دن پہلے ملک کے ہر گھر میں انہوں نے مجھے لہرایا تھا لیکن مجھے لہرانے کا مقصد نہیں جان سکے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان زندگی گزارتا ہے لیکن اپنی زندگی گزارنے کے مقصد پر غور نہیں کرتا۔

وہ مجھے اپنے دفتروں میں رکھتے ہیں لیکن کام چوری اور بددیانتی کے وقت میں انہیں نظر نہیں آتا۔ وہ مجھے اپنے اسکولوں میں لہراتے ہیں لیکن پھر بھی میری آواز ان تک نہیں پہنچی۔ وہ سنتے ہی نہیں ہیں کہ میں کیا کہتا ہوں، کیا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ وہ مجھے سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ وہ مجھے اپنے سینے پہ لگاتے ہیں، مجھے سلام پیش کرتے ہیں لیکن وہاں بھی میری آواز ان تک نہیں پہنچتی۔ وہ اپنے حالات پر روتے ہیں، اپنے حکمرانوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں لیکن اپنی غلطیوں سے غافل ہیں۔

یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہی ہیں جو مجھے بناتے ہیں، مجھے لہراتے ہیں۔ یہ سب مجھے لہرانے والے ہی ہیں۔

پھر جب یہ کوئی عظیم کام سرانجام دے کر دُنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو انہیں مجھ سے لپیٹا جاتا ہے اور شاید تب وہ مجھے سن لیتے ہوں لیکن تب کیا فائدہ؟ سب سے زیادہ تکلیف مجھے آزادی کے موقع پر ہوتی ہے جب ہر جگہ موجود ہوتے ہوئے بھی میں ان تک اپنی آواز نہیں پہنچا پاتا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ یہ مجھے بے شک نہ لہرائیں، اپنے سینے پہ نہ لگائیں۔ اپنی دفتروں کی میزوں پر مجھے نہ رکھیں۔ مجھے سلامی پیش نہ کریں۔ صرف مجھے دیکھیں اور مجھے سنیں اور جانیں کہ مجھے لہرانے کا مقصد کیا ہے اور میں ان سے کیا چاہتا ہوں؟ بس یہی میری آرزو ہے۔

میرے عزیز ہم وطنو! میرے وجود کا مقصد مجھے لہرانا نہیں ہے بلکہ میرے اوپر موجود چاند اور تارے کو دیکھنا اور سمجھنا ہے اور اس غریب بچے کی طرح ستاروں کو دیکھنے سے تم ستاروں تک نہیں پہنچ سکو گے بلکہ مجھے دیکھنے اور سننے اور میری بات پر عمل کرنے سے تم ستاروں سے بھی آگے جا نکلو گے جیسا کہ اقبال نے کہا تھا:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

لیکن جلدی کرنا! اس سے پہلے کہ میری آواز بند ہو جائے اور پھر تم چاہ کر بھی مجھے نہ دیکھ سکو! (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

وہ ایک سبق

(محمد احمد مظفر، پشاور)

''ہاں پیارے بچو! آج کا سبق غور سے سنو!'' میں نے حاضری لینے کے بعد سبق پڑھانا شروع کیا۔ ''اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنے بے شمار انعامات فرمائے ہیں۔ ہماری جان بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، بلکہ یہ ہمارے پاس اس کی امانت ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے، کیوں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی یہ عظیم نعمت ضائع ہو جاتی ہے......''

یہاں تک پہنچ کر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بے اختیار میرے سامنے ماضی کے صفحات پلٹتے چلے گئے اور نوجوانی کے دور کا

المناک واقعہ اور ماسٹر عنایت کی نصیحت کی ویڈیو میرے ذہن کی اسکرین پر تیزی سے چلنے لگی۔

"بس یار، میں نے تو آج فیصلہ کر لیا ہے۔" امجد عثمان کہنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا ابو نے وعدہ پورا کرنے سے انکار کر دیا ہے؟"

"وہ تو بس یوں ہی مجھے ٹرخا دیتے ہیں۔ مجھے پتا چل گیا ہے، نہیں خریدنی انہوں نے میرے لیے بائیک۔ آج ان کو میری قدر معلوم ہو جائے گی۔" وہ بولا۔ "اور کیا تمہارے ابو نے تمہیں ٹچ اسکرین موبائل لا کر دیا؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "انہوں نے ایک مہینے کی مہلت مانگ لی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ ایک مہینہ بعد ضرور لا کر دیں گے۔"

"چھوڑو یار، ہم نے پانچویں کلاس میں بھی کتنی محنت کی، کھیل کود چھوڑا، اپنی نیند برباد کی، دن رات ایک کر کے پہلی اور دوسری پوزیشن حاصل کی۔ صرف اس لیے کہ یہ لوگ وعدے کر کے پھر ٹال مٹول کریں۔ نہیں چاہیے مجھے ایسی زندگی......" وہ انتہائی جذباتی ہو چکا تھا کیوں کہ اس کے ساتھ کیے گئے وعدے ابھی تک وفا نہیں کیے گئے تھے۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو امجد! یہ بہت بڑا قدم اُٹھانے تم جا رہے ہو۔ تمہیں پتا ہے تمہارے والدین......"

"تو کیا نہیں جانا تم نے میرے ساتھ اس راستے پر؟" امجد بات کاٹتے ہوئے فوراً بول پڑا۔ "بس بھئی، مجھ سے تو اور برداشت نہیں ہو رہا۔ میں نے تو جیسے بھی ہو، آج یہ کام کرنا ہی ہے۔"

"آج ہم نے انہیں یہ احساس دلانا ہی ہے۔" اور پھر وہ اپنے ساتھ مجھے بھی یہ بھیانک قدم اُٹھانے پر اکسانے لگا اور بالآخر وہ مجھے تیار کرنے میں کام یاب ہو گیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ چلچلاتی دھوپ اور سورج بھی آگ کے شعلے برسا رہا تھا۔ ہم دونوں ایک مذموم عزم لیے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ ہمیں دور سے اپنی منزل نظر آنے لگی۔ ہاں! ویرانی اور گہری خاموشی میں ہمیں ریل کی پٹری نظر آنے لگی۔ ٹرین کے گزرنے میں چند منٹ باقی تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ہم تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔

ہم پٹری کے قریب کھڑے ہو گئے۔ اچانک مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھے دو دن پہلے پڑھا ہوا اسلامیات کا سبق "خودکشی" یاد آیا۔ ہمیں اسلامیات ماسٹر عنایت پڑھایا کرتے تھے۔ ان کی میٹھی اور پُرشفقت آواز میرے ذہن میں گونجنے لگی۔

اس خیال سے میرے جسم میں جیسے کرنٹ سی لگ گئی ہو۔ اچانک میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس دوران ٹرین انتہائی قریب آ چکی تھی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر امجد کو بھی پیچھے کھینچنے کی کوشش کی لیکن بے سود، اس دوران وہ لقمہ اجل بن چکا تھا۔ ٹرین اس کے اوپر سے گزر چکی تھی۔ وہ اپنے مذموم عزم کو عملی جامہ پہنا چکا تھا جب کہ مجھے ذات خداوندی نے اپنے فضل و کرم سے بچا لیا تھا۔

پھر وہ منظر بھی میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا کہ جب اس کی کچلی ہوئی لاش لائی گئی تو اس کے گھر کہرام مچ گیا۔ اس کی ماں زار و قطار رونے لگی۔ اس کا باپ بار بار اسے بائیک دلانے کا اعلان کر رہا تھا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

"ایکسکیوز می سر! آپ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے ہیں۔" میں انہی ماضی کی سوچوں میں غرق تھا کہ پراکٹر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اچانک میں اپنے خیالات کی دُنیا سے باہر آ گیا۔

"شکر ہے تیرا یارب! تو نے اپنے فضل سے میری حفاظت فرمائی۔" بے اختیار میرا دل تشکر کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔

"کاش! میرے ساتھ میرا دوست امجد عثمان بھی اس دن یہ سبق یاد کر لیتا۔" میں نے ایک سرد آہ بھری۔

پوری کلاس میری طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ آج میں انہیں بھی یہ عظیم درس دوں اور یہ خیر کا سلسلہ جاری رکھوں تاکہ آنے والی نسلیں بھی اس غلط راستے پر چلنے سے محفوظ ہو سکیں۔ میں گویا ہوا: "ہاں بیٹا! خودکشی بہت بڑا گناہ ہے۔ بیٹا، وعدہ کرو کہ زندگی میں کبھی اس عظیم گناہ کا ارتکاب نہیں کرو گے۔"

"نو سر!" "وعدہ ہے؟ پکا وعدہ؟" "یس سر۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ البتہ آج میں نے صرف اس قدر اضافہ بھی کیا:

"اور بیٹا! یہ سبق آگے بھی پہنچانے کی کوشش کرو گے نا۔"

"یس سر، یس سر، انشاء اللہ!" پوری کلاس نے یک زبان ہو کر کہا اور میں کلاس سے باہر نکلتے ہوئے دل میں کافی اطمینان محسوس کر رہا تھا۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

(ربیعہ ادریس مغل، گوجرانوالہ)

صحت کی حفاظت

حسن کے پیٹ میں درد تھا، وہ درد کی شدت سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ امی جان اسے دوا دیتی، ماموں جان آ گئے۔ وہ

ڈاکٹر تھے۔ پہلے وہ حسن کی حالت دیکھ کر پریشان ہوئے، پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ سارا درد کھانے کی وجہ سے ہے تو وہ مسکرانے لگے۔ حسن اپنا درد بھول کر ناراضگی سے بولا۔ "ماموں جان! میرا درد سے بُرا حال ہے اور آپ ہنس رہے ہیں۔" ماموں جان بولے۔ "بیٹے، میں اس لیے ہنس رہا ہوں کہ آپ نے خود ہی بیماری کو دعوت دی ہے۔ کہتے ہیں پیٹو اپنی مصیبت کا سبب خود ہوتا ہے۔ زیادہ کھا کر وہ اپنی صحت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ عادت اسے بیمار کر دیتی ہے، تم نے بھی اپنا ایسا ہی حال کیا ہے۔" حسن شرمندہ سا ہو گیا۔ ماموں بولے۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ کھانا عام طور پر دن میں تین مرتبہ کھایا جاتا ہے۔ تم کام سے فارغ ہوتے ہی کبھی چپس کھانا شروع کر دیتے ہو، کبھی سموسے، کبھی برگر اور کبھی دہی بھلے کھاتے نظر آتے ہو۔ گولی، ٹافی اور چیونگم تو ہر وقت تمہاری جیب میں ہوتی ہے۔ تمہارے پیٹ میں درد کیوں نہ ہو؟" حسن کے پاس ماموں کی کئی باتوں کا جواب نہ تھا۔ ماموں جان نے اسے دوا دی اور بستر پر لیٹ کر آرام کرنے کے لیے کہا۔ جب اس کی طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو ماموں جان نے کہا۔ "حسن! میں آپ کو اہم واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔" حسن ماموں کی طرف دیکھنے لگا۔ ماموں جان بولے۔ "بیٹا! ایک بار ایک بادشاہ نے پیارے نبیؐ کی خدمت میں ایک حکیم کو بھیجا کہ جب ضرورت پڑے تو مسلمانوں کا علاج کیا جائے۔ وہ حکیم کافی عرصے تک مدینے میں رہا مگر اس دوران کوئی شخص بھی دوا لینے کے لیے اس کے پاس نہ آیا۔ اس بات پر وہ حکیم بڑا حیران ہوا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا: "یہاں لوگ بیمار نہیں ہوتے کیوں کہ ان کا معمول ہے، جب اچھی طرح بھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتے ہیں اور کچھ بھوک ابھی باقی ہوتی ہے، وہ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔" حسن بڑے غور سے ماموں جان کی بات سن رہا تھا کہ اس کی امی جان ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ وہ بولیں۔ "حسن نبی کریمؐ کی اس بات سے ہمیں بڑا اہم سبق ملتا ہے۔ دیکھو نا! اگر کوئی مشین ہر وقت چلتی رہے تو اس کی کارکردگی متاثر ہو گی اور اس میں جلد ہی نقص پیدا ہو جائے گا۔ یہی حال معدے کا ہے۔ ماموں نے بالکل صحیح کہا ہے۔ ہمارا معدہ بھی ایک مشین کی طرح ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہنے سے یہ مشین خراب ہو جاتی ہے۔ کھانا کھانے میں وقفہ رہے، اسے آرام کا موقع ملتا رہے تو کارکردگی بھی بہتر رہے گی۔" حسن کی سمجھ میں ساری باتیں آ گئی تھیں۔ ماموں جان کے خاموش ہوتے ہی امی جان نے کہا۔ "مجھے امید ہے بیٹا کہ آئندہ تم بے وقت کھانا نہیں کھاؤ گے۔" حسن جلدی سے بولا۔ "میں آپ کی نصیحت پر ضرور عمل کروں گا اور نبی کریمؐ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی پوری کوشش کروں گا۔"

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

کمپیوٹر گیمز اور اس کا نقصان

(محمد جنید ناگرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

عبداللہ معمول کے مطابق اُٹھا اور کچھ کھائے پیئے بغیر کمپیوٹر پر گیمز کھیلنے لگا۔ عبداللہ ایک محنتی بچہ تھا، اس بار دوم پوزیشن لینے پر اس کے والد نے عبداللہ کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کیا اور اسے اعلیٰ قسم کا کمپیوٹر لے دیا۔ اسکول سے چھٹیاں ہو گئی تھیں اور چھٹیوں کے ساتھ عبداللہ کا معمول بالکل بدل گیا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے اُٹھتا اور کمپیوٹر آن کر کے گیمز کھیلنے شروع ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد اس کے دو دوست حسن اور حسین بھی آ گئے اور عبداللہ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ وہ تینوں دوست گیمز کھیلنے میں محو ہو گئے۔ یہ عبداللہ کا روزانہ کا معمول تھا۔ آج بھی وہ تینوں کمپیوٹر سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ عبداللہ کا سر چکرانے لگا اور اسے قے آنا شروع ہو گئی۔ یہ سب اچانک ہوا تھا۔ جب اس کی امی نے عبداللہ کی یہ حالت دیکھی تو اسے ایک پلنگ پر لٹا دیا اور اُسے دبانے لگیں۔ آہستہ آہستہ سب گھر والے عبداللہ کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے اور اس سے وجہ دریافت کرنے لگے لیکن عبداللہ کی حالت شدید بگڑ گئی اور اس کے سر میں بھی شدید درد ہو رہا تھا۔ اتنے میں عبداللہ کا بھائی ڈاکٹر صاحب کو لے کر آ گیا۔ ڈاکٹر نے انجکشن وغیرہ لگا کر اس کی بگڑتی حالت کو کنٹرول کیا۔ جب عبداللہ کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو ڈاکٹر نے عبداللہ سے پوچھا کہ یہ سب کیسے ہوا تھا۔ عبداللہ نے سب کچھ بتایا تو ڈاکٹر نے عبداللہ کے والد کو بتایا کہ لگاتار کمپیوٹر کے استعمال نے اس کے جسم کو بہت کمزور کر دیا ہے، اس کو آرام کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر گیمز نے اس کے دماغ پر بہت گہرا اثر کیا۔ بہرحال عبداللہ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ عبداللہ نے بھی وعدہ کیا کہ اب وہ زیادہ وقت پڑھائی پر صرف کرے گا اور اچھی اچھی اور مفید کہانیاں اور کتابیں پڑھے گا اور اپنے دوستوں کو بھی ضرورت سے زیادہ کمپیوٹر کے استعمال سے دُور رہنے کی تلقین کرے گا۔ سب گھر والوں کو بہت خوشی ہوئی۔ سب عبداللہ کے ان وعدوں سے بڑے خوش ہوئے۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

بھولے بھیا گئے ساہیوال

(غلام مصطفیٰ قادری، لاہور)

جمعہ کا دن تھا اور شام کا وقت۔ گھر میں سب اکٹھے چائے پی رہے تھے کہ امی بولیں۔ ''زاہد بیٹا...... آپ کی خالہ جان کا فون آیا ہے کہ انہیں ساہیوال سے یہاں لے آؤ۔ وہ بے چاری اکیلی یہاں نہیں آسکتیں۔''

''کیا...... ساہیوال......؟'' زاہد اُچھل پڑا۔

''جی ہاں...... ساہیوال...... کیا پہلے کبھی ساہیوال نہیں گئے؟''

''گیا تو ہوں مگر خالہ جان کا گھر کہاں ہے، یہ بھول گیا ہوں۔''

اوہو...... کوئی مسئلہ نہیں، میں آپ کو خالہ جان کا پتا دیتی ہوں۔ آپ کسی رکشے والے کو دکھانا...... اسے معلوم ہوا تو ٹھیک...... نہیں تو کسی دوسرے رکشے والے سے پوچھ لینا، وہ آپ کو چھوڑ آئے گا۔''

''ترکیب تو اچھی ہے...... کب جانا ہے......؟''

''آج جمعہ ہے، آپ اتوار کو صبح صبح چلے جانا۔ رات خالہ ثریا کے گھر رہنا اور صبح ان کے ہمراہ واپس آجانا۔''

''بالکل ٹھیک ہے......'' زاہد جسے سب پیار سے بھولے بھیا کہتے تھے خوش ہو کر بولے۔

''اب آپ تیاری کرو، بیگ وغیرہ تیار رکھو! اتوار کو لاری اڈا سے ساہیوال جانے والی بس میں بیٹھ جانا۔'' امی نے ہدایت کی۔

''ٹھیک ہے۔'' زاہد نے سعادت مندی سے کہا۔

بیگ تلاش کرنے میں انہیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ سیف کے اوپر ہی بیگ پڑا تھا۔ کپڑے، بنیان، موزے سب کچھ بیگ میں رکھ لیا مگر بھولے پھر آخر بھولے بھیا تھے، موبائل فون کا چارجر رکھنا بھی بھول گئے۔

اتوار کا دن آیا تو بھولے بھیا نے امی کا دیا ہوا پتا جیب میں رکھا اور لاری اڈا پہنچ گئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اچھی طرح گھر کا مکمل پتا سمجھ کر جاتے مگر کیا کریں بھولے بھیا، بھولنے کے ساتھ ساتھ جلد باز بھی تھے۔

لاری اڈا پر بسوں کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ آج چوں کہ اتوار کا دن تھا، اس لیے لاری اڈا پر رش معمول سے کچھ زیادہ تھا۔ کنڈیکٹر لوگوں کو زبردستی پکڑ کر بسوں میں سوار کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور کئی تو گلا پھاڑ کر شہروں کے نام لے رہے تھے۔ کوئی فیصل آباد کہہ رہا تھا تو کوئی خانیوال اور کوئی بورے والا...... ساہیوال جانے والی بسیں تھوڑا آگے تھیں۔

اچانک ایک ہٹا کٹا شخص بھولے بھیا کو پکڑ کر اپنی بس کی طرف کھینچنے لگا تو بھولے بھیا گھبرا گئے۔ ''بھائی! کیا کر رہے ہو؟''

''چلو...... چلو...... خانیوال چلو......''

بھولے بھیا کو زبردستی بس میں لے گیا۔ افراتفری میں بھولے بھیا بھول ہی گئے کہ انہوں نے خانیوال نہیں، ساہیوال جانا تھا۔ کنڈیکٹر ان کو بس میں سوار کر کے مزید سواریوں کی تلاش میں چلا گیا۔ بھولے بھیا نے امی کا دیا پتا نکالا، اس میں سب کچھ لکھا تھا مگر نیچے شہر کا نام نہیں لکھا تھا۔ بھولے بھیا نے ذہن پر بہت زور ڈالا کہ انہوں نے کون سے شہر جانا تھا مگر یاد نہ آسکا۔ تھک ہار کر وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔ جلد ہی وہ خراٹے لینے لگے۔

''اُٹھو...... بھائی اُٹھو کرایہ دو......'' کنڈیکٹر نے انہیں جھنجھوڑا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گئے۔ ''کتنا کرایہ......؟'' ''آٹھ سو روپے......''

''کیا......'' بھیا چلائے۔ ''ساہیوال کا کرایہ تو چار سو روپے ہے۔''

''کیا...... ساہیوال...... او بھائی! یہ بس تو خانیوال جا رہی ہے۔''

دراصل ہوا یہ کہ بھیا آنکھیں بند کیے نیند کی وادی میں پہنچے تو انہیں خواب میں خالہ جان کا چہرہ نظر آیا جو انہیں ساہیوال آنے پر خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ اب ان کو یاد آیا کہ انہوں نے ساہیوال جانا تھا۔

کنڈیکٹر نے انہیں وہیں راستے میں اُتار دیا اور تاکید کی کہ وہ ساہیوال والی بس میں بیٹھ جائیں۔ آدھ گھنٹے انتظار کے بعد بس آتی نظر آئی، خوش قسمتی سے وہ بس ملتان جا رہی تھی۔ بھیا نے ساہیوال اُتارنے کا کہا تو اس نے ہامی بھر لی۔

ساہیوال آ کر بھیا سیدھے خالہ کے گھر پہنچے۔ خالہ انہیں دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ امی کو فون کرنے کے لیے بھیا نے موبائل نکالا تو وہ آف ہو چکا تھا۔ بھیا نے بیگ میں دیکھا تو یاد آیا کہ چارجر تو وہ گھر بھول آئے ہیں۔ خالہ انہیں پریشان دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

''کیا ہوا......؟'' ''جی، وہ میں چارجر گھر بھول آیا ہوں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں......'' خالہ نے انہیں اپنا چارجر دیا۔ موبائل سے جب انہوں نے گھر فون کیا تو امی ان کی روداد سن کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

خیر ہے... نو ٹینشن

روبنسن سیموئیل گل

''تُم کیوں فکر کرتی ہو؟ ٹھیک کروا دوں گا...... خوامخواہ ٹینشن لیتی رہتی ہو۔''

''کیوں نہ فکر کروں، روزانہ صبح باورچی خانہ گیس کی بدبو سے بھرا ہوتا ہے۔ کل کو کوئی حادثہ ہو گیا تو کون ذمہ دار ہو گا؟''

''اوہو! مَیں نے تمھیں کتنی بار کہا ہے کہ جونہی وقت ملا، ٹھیک کروا دوں گا۔ تمہارے سامنے ایک دو بار پلمبر کو فون تو کیا ہے۔ اَب وہ مصروف ہے تو مَیں کیا کروں؟''

مجیب نے اپنی اہلیہ کو سمجھاتے ہوئے کہا مگر وہ بولی: ''دُنیا میں وہی ایک پلمبر تو نہیں ہے ناں؟ آپ کسی اور کو بلوا لیجیے، چولہا ہی ٹھیک کروانا ہے، کون سا کوئی پُل بنوانا ہے!''

''اچھا اچھا، کروا دوں گا...... تُم ٹینشن نہ لو۔''

مجیب کے یہ چند جملے تھے جو وہ دن میں سینکڑوں مرتبہ ادا کرتا تھا۔ گھر کی بات ہو یا دفتر کی...... بس اُس کا ایک سا حال تھا۔ دفتری کاموں کو التواء میں ڈالنا بھی معمول کی بات تھی۔ سرکاری ملازمت کا یہی بڑا فائدہ تھا کہ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا نہ تھا۔ چنانچہ جو لوگ بھی دفتری کام کے سلسلے میں آتے اُنھیں یہی جملے سُننے پڑتے۔

''اوہ...... خیر ہے جناب، ٹینشن کیوں لیتے ہیں؟''

''چھوڑیں جی مسئلہ ہی کوئی نہیں، ہو جائے گا آپ کا کام۔''

مگر مہینوں گزر جاتے کام جُوں کا تُوں پڑا رہتا اور بے چارے لوگ چکر پر چکر لگاتے رہتے تھے۔ سرکاری دفتروں کے رسم و رواج کو سمجھنے والے مجیب کی ٹال مٹول سے یہی اندازہ لگاتے کہ یہ چائے پانی کا معاملہ ہے مگر دِل چسپ بات یہ تھی کہ مجیب رشوت لیتا ہی نہ تھا اور اگر کبھی کسی کے اصرار پر تحفہ سمجھ کر اور اُن کی خوشی کی خاطر لے بھی لیتا تو تب بھی کام التواء میں ہی پڑا رہتا۔ اگر متعلقہ شخص تقاضا کرتا یا اُس تحفے کی یاد دہانی کرواتا تو وہ مسکراتے ہوئے ایک بار پھر لاپروائی سے کہہ دیتا۔

''جناب فکر ہی نہ کریں...... کیوں اتنی ٹینشن لیتے ہیں؟''

اور پھر حیرانی سے پوچھتا: ''اچھا وہ تحفہ آپ نے اِس کام کے سلسلے میں دیا تھا۔ چھوڑیں اِس کی کیا ضرورت تھی؟ چلیں آپ کی خوشی۔''

اور بے چارہ شخص اپنا سا مُنہ لے کر رہ جاتا۔

ایک روز چھوٹے بیٹے وقاص نے پوچھا: ''ابو! آپ نے میری فیس جمع کروا دی تھی؟ ٹیچر پوچھ رہی تھیں۔''

''اوہ! میرے ذہن سے بالکل نکل گیا، چلو خیر ہے...... نو ٹینشن، جلدی کروا دوں گا۔''

ٹینشن والی بات تو تھی کیوں کہ لیٹ فیس میں تاخیر کی وجہ سے جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا مگر کیا کیا جائے مجیب میاں کی ٹال مٹول اور کاموں کو التواء میں ڈالنے والی عادت اِس قدر پختہ ہو چکی تھی کہ یہ

چھوٹے موٹے نقصان ہوتے ہی رہتے تھے مگر وہ ایسے نقصانوں کو صرف یہ کہہ کر کہ خیر ہے نو ٹینشن، آسانی سے بُھلا دیتا تھا۔

جمعہ کا روز تھا مسز مجیب اپنی بہن کے ہاں جانے کے لئے تیار ہورہی تھیں۔ تینوں بچے احسن، وقاص اور گڑیا بھی بڑے خوش تھے۔ جمعہ کی آدھی چھٹی کے باعث مجیب بھی جلد گھر آچکا تھا۔ سب کے سب روانگی کے لئے تیار تھے۔

احسن نے آکر پیغام دیا:"ابو ہم سب تیار ہیں گاڑی نکالیں ناں۔"

بیٹے کی بات سن کر مجیب گیراج کی جانب بڑھا، گاڑی اسٹارٹ کی مگر بات نہ بنی۔ بیگم کا پارہ آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔

"جب آپ کو پتا تھا کہ گاڑی ٹھیک نہیں تو مکینک کو دکھالاتے۔"

"صبح تو بالکل ٹھیک تھی، نہ جانے اب کیا ہوگیا؟"

"آپ ہر دفعہ پروگرام خراب کر دیتے ہیں، بچے بھی تیار بیٹھے ہیں، اُدھر سالگرہ کا پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ میرے بھانجے کی پہلی سالگرہ ہے، آخر میری بہن کیا سوچے گی؟"

"اوہو! خیر ہے بیگم...... نو ٹینشن، ابھی اسٹارٹ ہو جاتی ہے گاڑی۔"

یہ کہتے ہوئے مجیب صاحب مسلسل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انجن سے کھڑ...... کھڑ...... کھڑڑڑڑ...... کی آواز آتی اور اُس کے بعد کچھ نہ ہوتا۔ بونٹ اُٹھایا گیا اور حسبِ روایت بیٹری کے ٹرمینلز کو دبایا گیا مگر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

"لگتا ہے بیٹری ڈاؤن ہوگئی، لیکن کوئی فکر والی بات نہیں۔ دھکا لگا کر اسٹارٹ ہو جائے گی۔ چنانچہ دونوں بیٹوں احسن اور وقاص کی مدد سے گاڑی کو دھکا لگا کر گیراج سے نکالا گیا اور پھر گلی میں ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ بے چارے احسن اور وقاص کی ساری تیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ پسینے میں شرابور تھکن سے ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ تب وہاں سے دو رحم دل انسانوں کا گزر ہوا۔ اُنہوں نے دھکا لگانے میں معاونت کی اور خدا خدا کر کے گاڑی کافی جتن کے بعد اسٹارٹ ہوگئی۔

مجیب کے انداز میں فخر نمایاں تھا، جب اُس نے اپنی بیوی سے کہا:"دیکھا میں نے کہا تھا ناں کہ فکر نہ کرو، گاڑی اسٹارٹ ہو جائے گی۔ تُم خواہ مخواہ ہر بات کی ٹینشن لینے لگ جاتی ہو۔"

مجیب آخر ایک باشعور انسان تھا۔ کبھی کبھی اپنی لاپروائی، ٹال مٹول اور خیر ہے، پھر سہی، نو ٹینشن والی عادت کے باعث ہو جانے والے نقصان پر پشیمان بھی ہو جاتا تھا، چنانچہ اِس عادت پر غالب بھی آنے کی کوشش کرتا مگر ناکام ہی رہتا تھا۔ آخرکار اِس کوشش کو بھی یہ کہہ کر پسِ پشت ڈال دیتا تھا کہ" خیر ہے...... نو ٹینشن!"

امی نے کہا، "آپ کے ابو گاڑی تیز چلائیں گے تو جلدی پہنچیں گے ناں۔"

گاڑی نے ایک دو بار جھٹکا مارا تھا اور یوں محسوس ہوا کہ بند ہونے لگی ہے، مگر مجیب میاں نے اپنی مہارت سے ریس دبائے رکھی اور انجن بند نہ ہونے دیا۔ اُسے بھی ڈر تھا کہ یہ بند ہوئی تو پھر شاید واقعی فنکشن میں شامل نہ ہوسکیں کیوں کہ فنکشن کا وقت چھ بجے تھا اور اب آٹھ سے بھی اُوپر کا وقت ہو چکا تھا۔ مجیب صاحب کے ایک جملے نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔

"اوہو، ٹینشن کی کون سی بات ہے، ہمارے یہاں لوگ کون سا وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔ تُم دیکھنا ہمارے بعد بھی کئی مہمان تشریف لارہے ہوں گے۔"

ابھی اُنہوں نے جملہ مکمل ہی کیا تھا کہ اگلی گاڑیوں کی رفتار سُست ہونے لگی۔

"اِس کو بھی ابھی بند ہونا تھا۔" مجیب نے اسٹیرنگ پر داہنا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

احسن بولا:"لو جی، لگتا ہے ٹرین آ رہی ہے، پندرہ بیس منٹ تو کہیں نہیں گئے۔"

واقعی پھاٹک بند ہونے والا تھا۔ سامنے کی طرف سے چند گاڑیاں تیزی سے آئیں تو اسی اثناء میں اِس جانب کی ٹریفک کو بھی نکلنے کا موقع مِل گیا۔ آگے والی گاڑیوں کی رفتار یک دم تیز ہوئی اور حسبِ روایت سب کوشش کرنے لگے کہ پھاٹک بند ہونے سے پہلے وہ اُس پار ہو جائیں۔ مجیب بھی ٹریفک کے اُسی بہاؤ میں تیزی سے آگے بڑھا، حالانکہ پھاٹک والا شور مچا رہا تھا کہ ٹرین آنے والی ہے۔ پھاٹک بند کرنا ضروری ہے مگر ہماری قوم کو ایسے موقعوں پر بہت زیادہ وقت کی قدر کا احساس ہونے لگتا ہے اور ہر کوئی وقت بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورتحال تھی۔ کیا گاڑی، کیا موٹر سائیکل یا سائیکل ہر کوئی اُس پار چلے جانے کا خواہش مند تھا، چاہے اِس خواہش کی تکمیل میں جہان سے ہی پار ہو جائے اور پھر وہی ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ریلوے پٹڑی کے

اُوپر سے گزرتے ہوئے مجیب کی گاڑی کو بمع اہل و عیال چند جھٹکے لگے اور پھر وہ آگے بڑھنے سے انکاری ہوگئی۔

رات کی تاریکی کے باعث ریلوے لائن کے دونوں جانب دُور دُور تک اندھیرا تھا...... اور پھر وہی دائیں جانب دکھائی دینے والا اندھیرا ہلکی ہلکی روشنی سے منور ہونے لگا۔

وقاص چلایا۔ ''ابو ٹرین آرہی ہے۔''

اب یہ وہ موقع نہ تھا کہ مجیب میاں اطمینان کے ساتھ کہہ دیتے، ''خیر ہے...... نوٹینشن۔''

اَب تو نوٹینشن، خیر ہے، پھر سہی...... مسئلہ ہی کوئی نہیں، جیسے جملے نہ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ اُن کے حلق میں ہی اٹک گئے تھے۔ وہ تو سکتے کے عالم میں تھے۔

اگلی والی ٹریفک کب کی پھاٹک پار کر چکی تھی جب کہ پچھلی جانب آنے والی چند کاروں کے ڈرائیوروں نے اسی میں عافیت جانی کہ پسپائی اختیار کرلیں۔ اب سڑکوں پر لکھا ہوا وہ جملہ اُن سب کے لئے سنہری اصول بن گیا کہ ''دیر سے پہنچنا کبھی نہ پہنچنے سے بہتر ہے۔''

تاریکی کو چیرتی ہوئی ریل گاڑی کی تیز روشنی جوں جوں آگے بڑھ رہی تھی، اِس خاندان کے چراغوں کی روشنی مدھم پڑتی محسوس ہورہی تھی۔ مجیب مسلسل چابی گھمائے چلے جارہے تھے اور ساتھ ساتھ خشک ہونٹوں پر بار بار زبان بھی پھیر رہے تھے۔ گلے کا بھی یہی حال تھا...... وہ بھی خشک ہوا پڑا تھا۔

ٹرین سر پر پہنچ چکی تھی اور دونوں جانب سے عوام کے نعرے چیخ پکار کی صورت میں بلند ہورہے تھے: ''گاڑی سے نکل آئیں، اوہ گاڑی سے نکلو...... مرو گے، جلدی کرو ٹرین پہنچ گئی ہے...... جلدی نکلو...... کیوں مرنا ہے؟'' وغیرہ وغیرہ۔

اِسی دوران پھاٹک والا دوڑ کر دوسری جانب کا دروازہ بند کرنے والا تھا مگر اِس صورت میں اِن کی گاڑی دونوں جانب سے پھنس جاتی۔ ٹرین چند سیکنڈ کے فاصلے پر تھی اور مسلسل ہارن دے رہی تھی۔

احسن بولا: ''ابو گاڑی نیوٹرل کریں ہم دھکا لگاتے ہیں۔''

تب وقاص اور احسن نے بھرپور زور لگا ڈالا مگر گاڑی کے پہیے پٹڑیوں پر اِس طرح پھنسے ہوئے تھے کہ نکل نہیں پا رہے تھے۔ ابو بھی اگلا دروازہ کھول کر دھکا لگانے لگے۔

اُسی لمحے پھاٹک والا گیٹ کے بجائے گاڑی کی جانب لپکا اور دو تین اور نوجوان بھی اپنی موٹر سائیکلیں چھوڑ کر دھکا لگانے کو پہنچے۔ ریل گاڑی بالکل سر پر پہنچ چکی تھی۔ مجیب صاحب کی اہلیہ آنکھیں پھاڑے سکتے کے عالم میں اپنی طرف بڑھتی ہوئی ٹرین کو دیکھ رہی تھیں۔ خوف کے مارے آنے والے پسینے نے اُن کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

سب کی کوشش سے گاڑی ٹرین کے پہنچنے سے چند لمحے پہلے دوسری جانب بحفاظت پہنچ چکی تھی۔ مجیب بلکہ اُن کے پورے خاندان کو یوں لگا کہ گویا اُنہیں نئی زندگی مل گئی ہو۔

یہی وہ لمحہ تھا جب مجیب نے ایک نئی زندگی گزارنے کا عہد اپنے دِل میں کیا۔ چند لمحوں کے لئے کوئی کچھ نہ بولا۔ سب پر سکتہ طاری تھا۔

سالگرہ پر بھی پہنچ ہی گئے...... اور وقت پر پہنچ گئے مگر مجیب اُس سارے فنکشن میں خاموش ہی رہا، تاہم اُس کے دِل کی تیز دھڑکن مسلسل گریہ وزاری کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کے حضور معافی مانگتی اور شکر گزاری پیش کرتی رہی۔

آج اُس کی سستی اور خیر ہے، نوٹینشن کی عادت سارے کے سارے خاندان کا شیرازہ بکھیر سکتی تھی۔ ایک ایسا بڑا نقصان ہوسکتا تھا جو ناقابلِ تلافی تھا مگر خدا تعالیٰ نے ایک تلخ اور خطرناک تجربے سے اُسے زندگی کا سبق سکھا دیا تھا جسے وہ آخری سانس تک بھلا نہیں سکتا تھا۔

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

آزاد مجھ کو کر دے، او قید کرنے والے!
میں بے زباں ہوں قیدی، تو چھوڑ کر دعا لے
(مائرہ حنیف، بہاول پور)

نہ جانے کون ہمارے لیے دعا کرتا ہے
میں ڈوبتا ہوں تو سمندر اُچھال دیتا ہے
(لائبہ قریشی، راول پنڈی)

اے ساکنانِ شہر! تازہ ہوا کے شوق میں
اتنے نہ در بناؤ کہ دیوار گر پڑے
(شکیل الرحمٰن، شیخوپورہ)

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

☆

پھلا پھولا رہے یا رب چمن میری اُمیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں
(ماریہ عبدالناصر، کلور کوٹ)

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے
(ملائکہ رانی، جھنگ صدر)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
(حرا ظفر، گوجرانوالہ)

یہی درس دیتا ہے ہمیں ہر شام کا سورج
مغرب کی طرف جاؤ گے تو ڈوب جاؤ گے

☆

نزع کی ہچکی کو ذرا غور سے سن
دمِ ہستی کا خلاصہ اس آہ میں ہے
(زائش خورشید، ایبٹ آباد)

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
(کشف طاہر، لاہور)

ماں باپ سی نعمت کوئی دُنیا میں نہیں ہے
حاصل ہو یہ نعمت تو جہاں خلدِ بریں ہے
(الینا قیصر، راول پنڈی)

بتوں سے تجھ کو اُمیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے
(انعم خالد، کراچی)

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے، موسیٰ ہی نہیں
(حینہ زاہد، راول پنڈی)

اب کے اس دل میں نہ جاگے گی اُمیدِ وفا
کبھی آئینے بھی ٹوٹ کر جڑے ہیں بھلا
(ثروت یعقوب، لاہور)

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام
(محمد احمد خاں غوری، بہاول پور)

پروانے کو شمع بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

☆

اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
(تماضر ساجد، صادق آباد)

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

میرا نہم جماعت کا نتیجہ آیا ہے اور میں آپ کی دعاؤں کی وجہ سے پاس ہوگئی ہوں۔ یہ تو میں نے آپ کو اچھی خبر سنائی ہے لیکن مجھے آپ سے ایک شکایت بھی ہے۔ میں کئی مہینوں سے آپ کو خط بھیج رہی ہوں لیکن آپ نے میرا خط اب تک شائع نہیں کیا۔ اُمید ہے اس بار آپ میرا خط ضرور شائع کریں گے۔ (شکریہ)
(عدن سجاد، جھنگ صدر)

میرا نام بلال حسین جٹ ہے اور میں گڑھا موڑ میں رہتا ہوں۔ میں تین سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا رسالہ ہے ناول ''زندہ لاش'' نے تو میرا مزا دوبالا کر دیا۔ میں اب یہ رسالہ بہت شوق سے پڑھتا ہوں لیکن خط لکھنے کی ہمت پہلی بار کر رہا ہوں۔ میرے خط کے لیے جگہ نہ بچی تو میرا نام ضرور شائع کیجیے گا۔
(بلال حسین جٹ، گڑھا موڑ)

ڈیئر ایڈیٹر صاحب! اُمید ہے بخیر و عافیت ہوں گے۔ ستمبر کا شمارہ بہ نسبت اگست زیادہ اچھا تھا۔ ''فرض'' کے عنوان سے کہانی بھیجی تھی مگر شائع نہیں ہوئی۔ اس مرتبہ کہانی بعنوان ''کالے شیشے'' بھیج رہا ہوں۔ ضرور آگاہ کریں کہ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں؟
(حضرت امین، پشاور)

اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ سب قارئین کو اور تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو دلی یوم دفاع مبارک ہو۔ اس مرتبہ بھی شمارہ بہترین تھا۔ تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ خاص کر خودداری، سمندر کے راہی، مسجد وزیر خان اور نیند کے مارے تو لاجواب کہانیاں تھیں۔ تمام سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ کھٹ کھاند گروپ اور ناول زندہ لاش بہترین ہیں۔ اگر آپ نے میرا خط شائع نہ کیا تو میری ماما مجھے یہ رسالہ پڑھنے نہیں دیں گی میں اپنے پیارے رسالے سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔ (سید محمد عثمان نفیس، گوجرانوالہ)

☆ اب آپ خوش ہیں......! خط لکھنے کا شکریہ۔

ایڈیٹر صاحب! میں آپ کا یہ رسالہ کافی سالوں سے پڑھ رہی ہوں۔ ہر مرتبہ بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ میں آپ کو پہلے بھی دو مرتبہ خط لکھ چکی ہوں مگر شائع نہیں ہوا۔ 6 ستمبر میری سالگرہ کا دن ہے اور اسی دن جنگ بھی ہوئی تھی۔ آپ کا رسالہ ہمارے گھر میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ سب اسے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس دفعہ سرورق بہت زبردست تھا۔ نعت ''درِ نبیؐ پر'' بہت پسند آئی۔ اس دفعہ کہانیاں خودداری، تعلیم سب کے لیے ہے، آزاد مجھ کو کر دے، او قید کرنے والے اور بوجھو تو جانیں بہت اچھی تھیں۔ ''نیند کے مارے'' کا تو بس پوچھیے ہی مت بہت زبردست تھی اور ''کھٹ کھاندی مشاعرہ'' تو پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ مسجد وزیر خان پڑھ کر تو وہاں کی سیر ہوگئی اور باقی سب تحریریں بھی بہت اچھی تھیں۔ زندہ لاش بہت زبردست سلسلہ ہے۔ محاورہ کہانی سے بہت سے مفہوم سمجھ آتے ہیں۔ پورا رسالہ بہت معلوماتی ہوتا ہے۔ میں کچھ اور چیزیں بھی بھیج رہی ہوں، اُمید ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی کریں گی۔ آپ کے رسالے کی اکثر صفحات رنگین نہیں ہوتے۔ میری یہ ننھی سی خواہش ہے کہ پورا رسالہ رنگین شائع کیا کریں۔ میں ''آپ بھی لکھیے'' میں کیسے حصہ لے سکتی ہوں؟ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)
(خدیجہ نعیم، لاہور)

☆ آپ اپنی کہانیاں پوسٹ کر دیں۔

ایڈیٹر صاحب! اُمید کرتی ہوں کہ خیریت سے ہوں گی۔ براہ مہربانی میرے خط کو ردی کی ٹوکری کی نذر نہ کیجیے گا کیوں کہ میں نے پہلی مرتبہ خط لکھا ہے۔ بہت عرصے سے میرا خط لکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔ آج میں نے سوچا کہ کیوں نا لکھ لیا جائے۔ اس ماہ کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ میں نے ساری کہانیاں پڑھیں، بہت اچھی تھیں مگر ان میں سے کھٹ کھاند گروپ، سمندر کے راہی، نیند کے مارے اور آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے بہت ہی اچھی تھیں۔ میں نے ایک کہانی بھی لکھی ہے جو آپ کو بھیج رہی ہوں جس کا عنوان ہے، ''سچ کی برکت۔'' براہ کرم ضرور شائع کریئے گا۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ (آمین)
(میمونہ مقصود بھٹی، گوجرانوالہ)

میں تین سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو جب میں اسکول سے گھر آتی ہوں تو اپنے بیڈ پر تعلیم و تربیت پا کر میں بہت خوش ہوتی ہوں۔ بس پھر مجھے یونی فارم، کھانا، بیگ سنبھالنا کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا اور میں صرف تعلیم و تربیت پڑھنے میں مصروف ہو جاتی ہوں۔ این میری شمل، ذائقہ کارنر اور لطیفے بہت پسند آئے۔ میرا یہ دوسرا خط ضرور شائع ہونا چاہیے۔ (میمونہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

محترم ایڈیٹر صاحب! میں اس رسالے کا بہت شوقین ہوں بلکہ یوں کہہ لیں کہ اس کے بغیر گزارہ ہی نہیں ہوتا۔ ہر سلسلہ ایک سے بڑھ کر ایک ہے اور یہ رسالہ بہت دلکش ہے۔ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ سلسلہ ''آپ بھی لکھیے'' میں اخلاقی سبق والی کہانی کا ہونا ضروری ہے یا کسی اور قسم کی بھی ہو سکتی ہے؟ مہربانی فرما کر جواب ضرور دیجیے گا کیوں کہ میں نے اس رسالے کے لیے ایک تحریر لکھی ہوئی ہے۔ آپ کے جواب سے رہنمائی ہو گی۔ (رانا شاہ زیب احمد)

☆ آپ ہر طرح کی کہانی لکھ سکتے ہیں۔ ضرور بھیجیے۔

جی میں بالکل ٹھیک ہوں، اُمید ہے کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ میرا نام عیشہ فاطمہ ہے، میں فیصل آباد میں رہتی ہوں۔ میں پانچ سال سے تعلیم و تربیت کی قاری ہوں لیکن پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں، اُمید ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی کریں گی۔ ذرا اپنی ردی کی ٹوکری سے دور رکھیے گا۔ میں نے کھوج لگائیے کا جواب بھیج رہی ہوں اس دفعہ خودداری، تعلیم سب کے لیے بہت زبردست کہانیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ (عیشہ فاطمہ، فیصل آباد)

جی جناب تو میں ہوں ہما ثانیہ ارشد، اس ماہ کا تعلیم و تربیت بہت اچھا ہے۔ پیارے اللہ کے پیارے نام تو ہر دفعہ ہی ہٹ ہوتے ہیں اور بانیٔ پاکستان تو مجھے بہت ہی پسند آئی تھی کیوں کہ قائداعظم میرے فیورٹ ہیرو ہیں۔ میں قائداعظم سے بے انتہا پیار کرتی ہوں۔ پلیز ہر دفعہ قائداعظم کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور شائع کیا کریں اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو خوش و خرم رکھے۔ (آمین)
(ہما ثانیہ ارشد، گوجرانوالہ)

ستمبر کا مہینہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے کیوں کہ اس مہینے میری سالگرہ آتی ہے۔ اس مہینے کے شمارے کا سرورق دیکھ کر شہیدانِ جنگ (ستمبر 1965ء) کی یاد تازہ ہو گئی۔ کہانیوں میں بیجو باورہ بہترین تھی۔ ''زندہ لاش'' اچھا ناول ہے۔ خدا تعلیم و تربیت کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین) (سعد علی، لاہور)

☆ آپ کو سالگرہ مبارک ہو!

پیاری ایڈیٹر صاحبہ! کیا حال ہے؟ ہم کئی سال سے یہ پیارا تعلیم و تربیت پڑھ رہے ہیں اور ہم ہر ماہ خط لکھتے ہیں لیکن آپ ہمارا خط شائع نہیں کرتے اور ہر دفعہ ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتے ہیں۔ مہربانی کر کے اس دفعہ ہمارا دل مت توڑیے۔ پلیز! ہمارا خط ضرور شائع کر دیں اور ہاں اس دفعہ خودداری، کھٹ کھاندی مشاعرہ، نیند کے مارے اور آزاد مجھ کو کر دے، او قید کرنے والے یہ سب سبق آموز کہانیاں تھیں۔ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا ہمیشہ کی طرح اب کی بار بھی بہت اچھا تھا اور آیئے مسکرایئے پڑھ کر ہنس ہنس کر بُرا حال ہو گیا مہربانی کر کے اس دفعہ ہمارا خط ضرور شائع کرنا۔ اللہ آپ کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا کرے۔ (آمین) (آمنہ عبدالستار، ذیشان احمد، چوکی)

میری طرف سے آپ سب کو عید الضحیٰ مبارک ہو۔ اس ماہ کا رسالہ سپر ہٹ تھا کیوں کہ سرورق پر پاک وطن کے سجیلے نوجوانوں کی تصویریں تھیں۔ پاک فضائیہ کے جیٹ طیارے، ٹینک اور مسلح نوجوان ایسے لگ رہے تھے جیسے دشمن پر حملہ آور ہو رہے ہوں۔ ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ حمد و نعت پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ کہانی خودداری بھی سبق آموز تھی۔ ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ (محمد اشرف، میانوالی)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بہت مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

حافظ ثناء عروج، فیصل آباد۔ نصر قاسم، لاہور۔ حافظہ عذرہ سعید چکی، شیخ جی۔ محمد حمزہ لغاری، میانوالی۔ فاطمۃ الزہرہ، لاہور۔ ابرار الحق، راجہ جنگ۔ صبا شوکت، گوجرانوالہ۔ مائرہ اشرف جوکالیا، محمد سجاد برکی۔ شاہ زیب حسن، پشاور۔ شانضہ مریم، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ایوب، کراچی۔ عثمان جاوید، واہ کینٹ۔ ذجیہہ شفقت، اکوڑہ خٹک۔ قاری محمد ندیم عطاری، اوکاڑہ۔ ملیحہ شہباز، محمد حمزہ مقصود، طیب مقصود، فیصل آباد۔ امیرہ شاہد، عبیرہ شاہد، گوجر خان۔ محمد سلیم مغل، محمد شاہد جمعہ، لاہور۔ سیدہ تحریم مختار، لاہور۔ عفیفہ ظفری، ڈیرہ اسماعیل خان، ایمن فاطمہ، ملتان۔ کشف جاوید، فیصل آباد۔ ثمن رؤف، فیصل آباد۔

برف کی ملکہ

احمد عدنان طارق

اللہ تعالیٰ کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں جانور اور انسان بھی بنائے۔ دُنیا کے یہ جانور ہر وقت اپنے اردگرد کے درختوں، پھولوں اور چاند ستاروں کو دیکھ دیکھ کر ان کی تعریف کرتے۔ جب اس طرح کچھ عرصہ بیت گیا تو وہ اُکتا گئے۔ اب انہوں نے خود پر توجہ دینی شروع کی اور ایک دوسرے کی مدح سرائی کرنے لگے۔

ہر جانور کی خواہش تھی کہ اس کی تعریف کی جائے اور اسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ دن کا زیادہ حصہ اپنی آرائش و زیبائش میں گزارنے لگے اور پھر جلد ہی جانوروں کے درمیان مقابلہ منعقد ہونے لگا۔ کئی دفعہ انعام چیتے کے حصے آیا تو کئی دفعہ شاہین مقابلۂ حسن جیت گیا۔ باقی جانور بھی انعام جیتنے کے لیے محنت کرتے رہے لیکن ایک ایسا جانور ان مقابلوں میں اُبھر کر سامنے آیا جس نے ہر سال انعام جیتنا شروع کر دیا اور وہ جانور تھا ایک مادہ برفانی ریچھ جو کہ بالکل سفید تھی۔ برف جیسی سفید تو نہیں لیکن دوسرے جانوروں سے کہیں زیادہ سفید۔ ہر کوئی اس کی تعریف میں جُتا تھا لیکن اندر ہی اندر اس سے حسد کرتا تھا۔ سب اسے کہتے کہ اے برفانی ریچھ! تم اپنی سفید اور ملائم کھال کی وجہ سے ہم سب سے زیادہ خوب صورت ہو۔ یہ تعریفیں سن سن کر برفانی ریچھ کا دماغ خراب ہونے لگا۔ وہ بہت ہی مغرور ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت اپنی کھال کو دھوتی اور چمکاتی رہتی تاکہ اس کی کھال مزید سفید نظر آئے۔ اب وہ ہر سال خوب صورتی کا انعام جیتنے لگی۔ ان سالوں میں صرف ایک بار ایسا موقع آیا جب کسی اور جانور نے یہ انعام جیت لیا، کیوں کہ اس سال بہت بارش ہوئی اور مادہ برفانی ریچھ خود سے کہتی: ”مجھے باہر نہیں جانا چاہیے کیوں کہ بارش کی وجہ سے ہر جگہ کیچڑ ہے اور دوسرے جانور کیچڑ سے لت پت مقابلے میں آئیں گے اور میری کھال چھینٹوں سے گندی کر دیں گے۔“ لہٰذا اس سال مقابلہ شاید کوئی بطخ یا مینڈک جیت گیا تھا۔

ہر وقت اس کے اردگرد نوجوان جانوروں کا ایک جھمگٹا لگا رہتا جو اس کی تعریفیں کرتا رہتا۔ اس کی تعریف کرنے والوں میں زیادہ پیش پیش سمندری شیر تھے جو اس کی کچھار کے آگے بیٹھے رہتے۔ وہ جب بھی کچھار کے سامنے آتے تو شور مچا کر اس کی تعریف کرتے۔ مادہ برفانی ریچھ کو دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ اپنی سفید کھال سے پیار تھا۔ اب اگر ذرا سی بھی مٹی اُڑ کر اس کی کھال پر پڑتی تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتی۔ کئی دفعہ تو اس کے آنسو نکل آتے اور وہ سب کو کہتی: ”میں کیسے اُمید کر سکتی ہوں کہ اس ملک میں مَیں خوب صورت

رہ سکتی ہوں۔ یہاں کی مٹی کی وجہ سے تم نے مجھے کبھی مکمل صاف شفاف نہیں دیکھا۔ تم نے مجھے جتنا دیکھا ہے میں اس سے کہیں زیادہ سفید ہوں۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھے کسی ایسے ملک چلے جانا چاہیے جہاں مٹی نام کی کوئی شے نہ ہو۔ تم ہی بتاؤ، میرے لیے کون سا ملک مناسب رہے گا؟'' وہ اسی طرح کی باتیں اکثر کرتی رہتی کیوں کہ اس کے جواب میں سمندری شیر اسے اکثر کہتے: ''نہیں نہیں، مہربانی فرما کر ہمیں چھوڑ کر مت جانا۔ ہم تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بدلے میں تم جیسا کہو گی ہم ویسا ہی کریں گے۔'' یہ باتیں سن کر مادہ ریچھ خوش ہو جاتی کیوں کہ اس طرح کی لچھے دار باتیں سننا اس کی کمزوری بن چکی تھی۔ سارا دن سمندری شیر اسے گھورتے رہتے اور متاثر ہوتے رہتے اور شام کو جب گھر جاتے تو اس کی نقل کرتے ہوئے خود کو مادہ ریچھ کی طرح بنانے کی کوشش کرتے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوتا کیوں کہ سب جانوروں کے رنگ مختلف تھے۔ کوئی کالا تھا تو کوئی بھورا، کوئی پیلی ادرک کے رنگ کا تھا تو کسی کے جسم پر دھبے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی سفید نہیں تھا۔ اس لیے جلد ہی ان میں سے بہتوں نے خود کو خوب صورت بنانے کی کوشش ترک کر دی لیکن مادہ برفانی ریچھ کو دیکھنے کی عادت نہ بدل سکے۔ کچھ تو آتی دفعہ پکنک کا سامان ساتھ لے آتے۔ وہ درختوں کے نیچے دوسرے مجمعے کے ساتھ بیٹھ جاتے۔ مادہ دریائی بھینسا اپنے بچوں کو کہتی: ''ذرا اس کی طرف دیکھو، تمہیں بھی بڑا ہو کر اس کی طرح خوب صورت بننا ہے۔'' لیکن اب یہ باتیں بھی مادہ برفانی ریچھ کو خوش نہیں کرتی تھیں۔ وہ ٹھنڈا سانس لے کر کہتی: ''یہ مجمع کتنی مٹی اُڑاتا ہے۔ میں ان سے کیسے پیچھا چھڑوا سکتی ہوں؟ کاش میں کسی صاف شفاف ملک میں جا سکتی۔''

سب جانور تو اس کی تعریفیں سن کر اس سے حسد کرتے ہی تھے لیکن ایک پرندہ ایسا بھی تھا، جو حسد میں سب سے آگے تھا اور وہ تھا سنہری عقاب! وہ بہت ہی زیادہ خوب صورت پرندہ تھا لیکن وہ سفید نہیں تھا۔ بار بار مقابلۂ حسن میں وہ مادہ برفانی ریچھ کے بعد دوسری پوزیشن پر آتا اور کئی دفعہ غصے میں بڑبڑاتا: ''کاش برفانی ریچھ یہاں نہ ہوتی تو ہر دفعہ میں فاتح ہوتا۔'' وہ ہر وقت تدبیریں سوچتا کہ کس طرح مادہ برفانی ریچھ سے چھٹکارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آخر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آ ہی گئی۔ سنہری عقاب ایک پردیسی پرندہ تھا جو ہر وقت سفر میں رہتا تھا۔ وہ دُنیا کے ہر ملک کو گھوم پھر کر دیکھ چکا تھا اور سبھی جانور اس بات کو جانتے تھے۔ ایک دفعہ وہ مادہ برفانی ریچھ کے پاس آیا اور اسے کہنے لگا: ''میں ایک ایسے ملک کو جانتا ہوں جو تم سے بھی صاف شفاف اور سفید ہے۔ ہاں! مجھے پتا ہے کہ تم بہت سفید ہو مگر وہ ملک تم سے زیادہ سفید ہے۔ اس کی چٹانیں اس طرح چمکتی ہیں جیسے آئینے اور زمین پر سفید برف اس طرح جمی ہوئی ہے جیسے دودھ سے بنی آئس کریم۔ وہاں مٹی کا نام و نشان نہیں ہے، نہ ہی گرد و غبار ہے۔ تم

اس ملک میں جا کر زیادہ پیاری اور سفید ہو جاؤ گی اور کیوں کہ وہاں کوئی نہیں رہتا، اس لیے ظاہر ہے کہ تم فوراً وہاں کی ملکہ بن جاؤ گی۔'' یہ باتیں سن کر مادہ برفانی ریچھ جوش سے پاگل ہوگئی۔ وہ چلا کر کہنے لگی: ''واہ واہ! یہ ملک تو لگتا ہے جیسے میرے لیے ہی بنا ہے۔ وہاں مجمع نہیں ہے۔ گرد وغبار نہیں ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ وہاں چٹانیں آئینے کی طرح چمکتی ہیں۔'' سنہری عقاب نے بات کو اور بڑھا دیا اور کہنے لگا: ''چٹانیں آئینے کی طرح نہیں بلکہ یوں سمجھو ہیرے کی طرح چمکتی ہیں اور بارش اس طرح برستی ہے جیسے روئی کے گالے گر رہے ہوں۔'' مادہ برفانی ریچھ سن کر پھر چلائی: ''ابھی! میں اس گھورتے مجمع کو چھوڑ کر اور اس مٹی اور گرد وغبار سے دُور بھاگ جاؤں گی۔'' اس نے دوسرے جانوروں کو بتایا کہ وہ یہ ملک چھوڑ کر جا رہی ہے۔ یہاں میں بہت گندی ہو جاتی ہوں۔ پھر سنہری عقاب نے ایک وہیل مچھلی کو کرائے پر لیا تا کہ مسافر کو اس کے ملک چھوڑ دے۔ وہ وہیل مچھلی کے سر پر خود بیٹھ گیا تا کہ اسے راستہ دکھا سکے۔ مادہ برفانی ریچھ اس کے شانے پر بیٹھ گئی اور سمندری شیر اس کی ہزار منت کر کے مچھلی کی دُم پر سوار ہو گئے۔ کچھ دنوں کے سفر کے بعد وہ بحرِ منجمد شمالی پہنچ گئے جہاں ہر طرف برف ہی برف تھی۔ وہاں جانوروں کا ہجوم نہیں تھا اور جس طرح سمندری عقاب نے بتایا تھا، گرد بالکل نہیں تھی۔ ہر چیز خوب صورت، صاف اور سفید تھی۔ مادہ برفانی ریچھ نے دیکھا کہ واقعی چٹانیں سورج کی کرنوں سے ہیرے کی انی کی طرح چمک رہی ہیں۔

وہ وہیل مچھلی سے فوراً اُتری اور بھاگ کر قریبی گلیشیئر پر چلی گئی تا کہ سفر کے دوران اپنی کھوئی ہوئی خوب صورتی بحال کر سکے۔ اس کے بعد آج تک وہ کبھی ایک گلیشیئر پر بیٹھی ہوتی ہے تو کبھی دوسرے پر۔ اس کے ساتھ سمندری شیر بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کی کھال پہلے سے زیادہ سفید ہوگئی ہے اور جوں جوں وہ سفید تر ہوئی ہے سمندری شیر اس کی زیادہ تعریفیں کر رہے ہیں۔ وہ بھی جب خود کو مزید خوب صورت ہوتے دیکھتی تو کہتی ہے: ''میں دوبارہ کبھی اس گرد آلود ملک میں واپس نہیں جاؤں گی۔'' اس لیے آج تک وہ وہیں ہے اور اس کی تعریف کرنے والے سمندری شیر بھی۔ یہ تھا سفر برفانی ریچھ کا، برف کی وادیوں میں جانے کا سفر۔ ادھر سنہری عقاب اُڑتا ہوا واپس دوسرے جانوروں کے پاس گیا اور انہیں بتایا کہ مادہ برفانی ریچھ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی گئی ہے۔ وہ سب بہت خوش تھے اور فوراً خود کو مزید خوب صورت بنانے میں جُت گئے۔ ہر کسی کے دل کا خیال اس کے لبوں پر تھا۔ ''اب مادہ برفانی ریچھ نہیں رہی، ہوسکتا ہے اس دفعہ کا انعام میں ہی جیت لوں۔'' سنہری عقاب بھی خود کہہ رہا تھا: ''یقیناً! میں ہی جانوروں میں سے سب سے خوب صورت ہوں۔'' سبھی جانور یہ بھول چکے تھے کہ خدا نے سب کو کچھ نہ کچھ خوب صورتی دی ہے۔ لہٰذا اگلا مقابلہ کون جیتا؟ ایک بھورا چوہا۔ جو تھا تو بھورا لیکن اس کے بہت خوب صورت گلابی پاؤں تھے۔ ☆☆☆

بقیہ: حضرت عائشہ صدیقہ

پردہ کا بہت خیال رکھتی تھیں، آیتِ حجاب کے بعد تو یہ تاکیدی فرض ہو گیا تھا۔ جن ہونہار طالب علموں کا اپنے یہاں بے روک ٹوک آ جانا اور رکھنا چاہتی تھیں، آنحضرتؐ کی ایک خاص حدیث کے مطابق اپنی کسی بہن یا بھانجی سے ان کو دودھ پلوا دیتی تھیں اور اس طرح ان کی رضاعی خالہ یا نانی بن جاتی تھیں اور ان سے پردہ نہیں ہوتا ورنہ ہمیشہ طالب علموں کے اور ان کے درمیان پردہ پڑا رہتا تھا۔ ایک دفعہ حج کے موقع پر چند بیبیوں نے عرض کی کہ ''اے ام المومنین! چلیے، حجرِ اسود کو بوسہ دے لیں، فرمایا: تم جا سکتی ہو، میں مردوں کے ہجوم میں نہیں جا سکتی۔'' کبھی دن کو طواف کا موقع پیش آتا تو خانۂ کعبہ مردوں سے خالی کرا لیا جاتا تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ طواف کی حالت میں بھی چہرہ پر نقاب پڑی رہتی تھی۔ ایک غلام کو مکاتب کیا تھا اس سے کہا کہ جب تمہارا زرِفدیہ اتنا ادا ہو جائے میں تو تمہارے سامنے نہیں آ سکتی۔ اسحاق تابعی نابینا تھے، وہ خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت عائشہؓ نے ان سے پردہ کیا۔ وہ بولے کہ مجھ سے کیا پردہ، میں تو آپ کو دیکھتا نہیں۔ فرمایا، تم مجھے نہیں دیکھتے، میں تو تم کو دیکھتی ہوں۔ مردوں سے شریعت میں پردہ نہیں، لیکن ان کا کمال احتیاط دیکھئے کہ وہ اپنے حجرہ میں حضرت عمرؓ کے دفن ہونے کے بعد بے پردہ نہیں جاتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ نے سترہ رمضان المبارک 57 ہجری میں وفات پائی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ ان کی وفات پر حضرت عمرؓ سے پوچھا گیا۔ ''سیدہ عائشہؓ کی موت کا غم کس کس نے کیا۔'' تو جواب دیا۔ ''جس جس کی وہ ماں تھیں، اسی کو ان کا غم تھا یعنی تمام مسلمان۔''

شیخ عبدالحمید عابد

رنگ برنگی، پیاری پیاری، نازک تتلیاں آپ سب کو اچھی لگتی ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ انہیں پکڑ لیا جائے مگر جب انہیں پکڑنے جاتے ہیں تو یہ اُڑ جاتی ہیں۔ اُڑتی تتلیاں تو اور بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

آیئے! ہم آپ کی ملاقات تتلیوں سے کروائیں۔ تتلی کیڑوں کی خوب صورت ترین قسم ہے۔ دُنیا بھر میں تقریباً دس لاکھ قسم کے کیڑے پائے جاتے ہیں جن میں تتلیوں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے کیڑوں کی قسمیں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہیں۔ ان میں تتلیوں کی قسمیں پندرہ ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔

پاکستان اور ہمسایہ ممالک میں تتلیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی آب و ہوا تتلیوں کے لیے بے حد موزوں ہے۔

تتلیاں بہترین ہواباز ہوتی ہیں اور اپنی نازک پنکھڑیوں کو اُڑنے کے لیے بڑی خوبی سے استعمال کرتی ہیں۔ تتلیاں عام طور پر صرف دن میں اُڑتی ہیں، رات میں اندھیرے اور سردی کی وجہ سے انہیں اپنے پروں کو حرکت دینے میں مشکل ہوتی ہے۔

اگر آپ کبھی غور سے تتلی کو دیکھیں تو اس کے جسم کے مختلف حصے آپ کو نظر آئیں گے۔ سب سے اوپر تتلی کا سر ہوتا ہے۔ اس کے بعد حلق اور پھر پیٹ جو دس چھوٹے چھوٹے حصوں سے بنا ہوتا ہے۔ یہ سب آپس میں جڑے ہوتے ہیں۔ تتلی کا اصل حسن اس کے پَروں میں ہے جو اس کے پیٹ سے جڑے ہوتے ہیں۔ پَر بہت نرم، رنگین اور خوب صورت ہوتے ہیں۔ تتلی کے سر پر ایک خاص جگہ سے دھاگے سے نکلے ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو محسوس کرتی ہے۔ اسی لیے جب آپ اسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ اُڑ جاتی ہے۔ تتلی کی آنکھیں سر پر ہوتی ہیں اور ان کی خاص بات یہ ہے کہ یہ رنگوں کی شناخت بھی کر سکتی ہے۔ تتلی کی خوراک پھولوں کا رس ہے۔ اس کے سر کے نچلے حصے میں ایک نلکی سی ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ پھولوں سے رس چوستی ہے اور اس کے بعد نلکی لپیٹ لیتی ہے۔ یہ خاص بات صرف تتلیوں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے کیڑوں ہی میں پائی جاتی ہے۔

تتلیوں اور دوسرے کیڑوں میں نمایاں فرق ان کے رنگین پَر ہیں۔ یہ رنگ دراصل تتلیوں کے پَروں پر موجود مختلف پرتوں کی وجہ سے نظر آتے ہیں۔ کئی رنگوں کی پرتیں باقاعدہ اور ایک خاص ترتیب سے ہوتی ہیں۔ تتلیوں کے جسم میں ایک خاص کیمیائی مادہ ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنے دشمنوں سے بچنے یا انہیں ڈرانے کے لیے اپنا رنگ تبدیل کر لیتی ہیں۔

تتلی اپنے پَروں کے رنگوں ہی کے ذریعے اپنے جسم کے درجہ حرارت کو برقرار رکھتی ہیں۔ صبح کے وقت جب درجہ حرارت کم ہوتا ہے تو تتلی کو گرمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت یہ سورج کی روشنی میں اپنے پَر پھیلا دیتی ہے۔ اس طرح پَروں کے گہرے رنگ سورج کی روشنی کو جذب کر لیتے ہیں۔ کئی تتلیوں کے رنگوں سے پتا چل جاتا ہے کہ وہ نر ہیں یا مادہ۔

تتلیاں صبح کے وقت کچھ تھکی تھکی سی رہتی ہیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے، یہ چست و چالاک ہوتی جاتی ہیں۔ بعض تتلیاں صبح کے وقت پیلے رنگ کے پھولوں سے رس سمیٹتی ہیں جب کہ دوپہر میں سرخ رنگ کے پھولوں پر بیٹھتی ہیں۔ شام کے وقت واپس پیلے پھولوں پر آ جاتی ہیں۔

دوسرے کیڑوں کی طرح تتلیاں بھی انڈے دیتی ہیں مگر یہ مرغی کے انڈے کے برابر نہیں ہوتے بلکہ بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس میں مرغی کے انڈے کی طرح چوزہ بھی نہیں نکلتا بلکہ یہ

انڈا تتلی بننے تک تین مرحلوں سے گزرتا ہے۔ یعنی انڈے سے لاروا، لاروا بننے سے پیوپا اور آخر میں پیوپا سے مکمل تتلی بنتی ہے۔ تتلیوں کی پیدائش یعنی پیوپا سے تتلی بننے کا عمل عموماً جون جولائی کے مہینوں میں ہوتا ہے۔ تتلی صرف چند ہفتوں تک زندہ رہتی ہے۔ بعض تتلیاں چھ ماہ سے زیادہ عرصہ تک زندہ رہتی ہیں۔ تاہم ان کی اوسط عمر تین سے چار ماہ تک کہی جا سکتی ہے۔

تتلیاں پالنا بھی ایک دل چسپ مشغلہ ہے۔ قسم قسم کی تتلیاں جمع کر کے آپ ان سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ دُنیا میں کئی عجائب گھروں میں تتلیوں کی مختلف اقسام محفوظ کر کے رکھی گئی ہیں۔ اگر آپ تتلیاں پالنا چاہتے ہیں تو انہیں خرید کر اپنے باغ میں چھوڑ دیں کیوں کہ اپنی شوخ طبیعت کے باعث یہ آپ کے پڑوس میں بھی جا سکتی ہیں۔ انہیں بلانے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے لان میں رنگ برنگ کے پھول لگائیں۔ اس طرح تتلیاں آپ کا باغ چھوڑ کر نہیں جائیں گی۔

تتلیاں انسانوں کے لیے بڑی کارآمد ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ ذمہ داری دی ہے کہ یہ پھلوں کی پیداوار بڑھاتی ہیں۔ تتلیاں جب پھول پھول پر بیٹھتی ہیں تو پھولوں سے پھل بننے کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ اس طرح تتلیاں ہمارے لیے خوراک تیار کرنے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔

کرہ ارض پر تتلیوں کی بے شمار اقسام پائی جاتی ہیں جن میں سے کچھ کی جسامت بڑی اور کچھ کی بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ چند اقسام کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1- الیگزینڈرا برڈ ونگ (Alexandra Bird Wing)

یہ اپنی جسامت کے لحاظ سے تمام اقسام میں سب سے بڑی تتلی ہے۔ اس کا سائز تقریباً 30 سینٹی میٹر تک ہوتا ہے۔ جو کہ بارہ انچ یعنی ایک فٹ تک ہوتا ہے۔

2- مائیکرو سائیکی آریانا (Micro Psyche Ariana)

ہلکے براؤن رنگ کی یہ خوب صورت تتلی کرہ ارض پر سب سے چھوٹی تتلی ہے۔ اس کا سائز تقریباً 8 ملی میٹر ہوتا ہے۔ یہ افغانستان میں پائی جاتی ہے۔

3- پینٹڈ لیڈی (Painted Lady)

یہ تتلیوں کی خوب صورت اقسام میں سب سے بکثرت پائی جانے والی قسم ہے۔ یہ امریکہ و میکسیکو، یورپ و انڈیا اور ایشیا کے بہت سارے ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ عام طور پر کالے، براؤن اور اورنج رنگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کا سائز عام طور پر 5 سے 7 سینٹی میٹر تک ہوتا ہے۔

4- گولیتھ برڈ ونگ (Goliath Bird Wing)

یہ روئے زمین پر جسامت کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے۔ سائز میں 28 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ بھورے اور سبز رنگ میں پائی جانے والی یہ تتلی زہریلی ہوتی ہے اور انڈونیشیا کے جنگلات میں پائی جاتی ہے۔

5- جولیا (Julia)

امریکہ میں پائی جانے والی یہ خوب صورت تتلی پیلے اور اورنج رنگ کی ہوتی ہے۔ اس کا سائز 3 سے 4 انچ تک ہوتا ہے۔

6- مونارک (Munarch)

تتلی کی یہ قسم بھی زہریلی ہوتی ہے اور دُنیا کے زیادہ تر ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ اس کا سائز 8.6-12.4 سینٹی میٹر تک ہوتا ہے۔

7- وائسرائے (Viceroy)

بھورے اور نارنجی رنگ کی یہ تتلی، شکل کے برعکس مونارک سے ملتی جلتی ہے۔ مونارک کے برعکس یہ زہریلی نہیں ہوتی۔ پَروں کے اوپر سیاہ رنگ کی لائن اسے مونارک سے منفرد بناتی ہے۔ یہ کینیڈا اور میکسیکو میں ملتی ہے اور سائز میں 7-7.5 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔

8- زیبرا سوالو ٹیل (Zebra Sawallow Tail)

سفید اور سیاہ رنگ کی منفرد قسم ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں پائی جاتی ہے۔ پَروں کی پچھلی سائیڈ پر لمبی دم اس کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ یہ سائز میں 5-7 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔

9- پوسٹ مین بٹر فلائی (Post Man Butter Fly)

تتلی کی زہریلی اقسام میں سے ایک ہے۔ امریکہ اور برازیل میں پائی جاتی ہے۔ یہ تتلی بھورے اور نارنجی رنگ کی ہوتی ہے۔ سائز 6-8 سینٹی میٹر ہوتا ہے۔

10- سورن ڈوگ فیس (Sohern Dog Face)

پیلے رنگ کی یہ تتلی جنوبی امریکہ کے علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ سامنے والے پَروں کے درمیان میں سیاہ رنگ کا نشان اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ ☆☆☆

سندھ کا مری
گورکھ ہل اسٹیشن

گورکھ براہوی زبان سے اخذ کیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے بھیڑیا۔ کراچی سے 450 کلومیٹر شمال میں اور دادو سے 100 کلومیٹر مغرب کی سمت ایک خوب صورت مقام گورکھ ہل اسٹیشن ہے۔ سطح سمندر سے 5688 فٹ بلند ہونے کی وجہ سے یہاں درجہ حرارت 17 ڈگری سینٹی گریڈ اور جنوری میں منفی 5 ڈگری سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے۔ یہاں میٹھے پانی کے چشمے اور آبشار موجود ہیں۔ قدرتی مناظر، ماحول اور آب و ہوا کے حوالے سے اسے سندھ کا مری کہا جاتا ہے۔ کراچی سے دادو تک بس سروس یا ریل گاڑی کے ذریعے رسائی آسان ہے۔ دادو سے جوہی روڈ کے راستے یہاں تک کا فاصلہ صرف 94 کلومیٹر ہے جب کہ سیہون سے 140 کلومیٹر اوپر تک جانے کے لیے جیپ بک کرائی جا سکتی ہے۔

گورکھ کا نام سنتے ہی سندھ کے اس علاقے کا تصور اُبھرتا ہے جو مری کی طرح سطح سمندر سے بلند اور پہاڑی علاقہ ہے۔ یہاں پر جون جولائی کی سخت گرمی کے مہینوں میں دسمبر کی سردیوں جیسا مزا آتا ہے۔ سرسبز پہاڑی راستے، تیز رفتار ندی نالے اور حسین چراگاہوں کا مسکن یہ علاقہ سندھ کے رہائشیوں کے لیے مری کا متبادل ہے۔ جب لال شہباز قلندر کا عرس شروع ہوتا ہے تو زائرین قافلوں کی شکل میں مست قلندر کی دھن پر رقص کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لال شہباز قلندر کے عرس میں پنجاب اور سندھ سے بڑی تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں۔ سیہون کے بازار میں رُک کر کھانا کھایا جا سکتا ہے۔ آخری گاؤں واہی پاندھی ہے، جس کے سرسبز کھیت عبور کریں تو پہاڑی موڑ شروع ہو جاتے ہیں۔ سیاح تپتے میدانوں سے گزر کر ان پہاڑوں پر پہنچتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ یہ بھی سندھ کا حصہ ہیں۔ بلند چٹانی سلسلے گاڑی کا راستہ روک لیتے ہیں۔ برساتی نالوں میں پانی کا شور سنائی دیتا ہے اور سڑک کنارے درختوں پر پرندے انجان سیاحوں کو حیرت سے تکتے ہیں۔

ان پہاڑیوں پر چلتے چلتے ایک نئی دُنیا کا آغاز ہو جاتا ہے۔ انسان صدیوں پیچھے ماضی کی طرف چلا جاتا ہے۔ فضائیں سنسان اور خاموش ہیں۔ عجیب و غریب بناوٹ کے پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ نیلے اور سرخ رنگ کے پتھر مضبوطی سے اَٹے ہیں جیسے کوئی سنگ تراش اپنا کام ادھورا چھوڑ کر گئے ہوں۔ راستے میں انسان

بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ لوگ بلوچستان کے پہاڑوں سے اونٹوں پر سوار ہو کر آتے ہیں۔ ان کے کپڑوں پر پیوند اور دھجیاں لگی ہیں۔ اکثر کے پیروں میں جوتے بھی نہیں۔ بوڑھوں کے چہروں پر صدیوں کی بھوک ہے مگر پاکستانی ہیں اور زبان پر کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہیں۔ صبر سے روکھی سوکھی کھا لیتے ہیں۔

پہاڑیوں کے آس پاس تالاب بھی نظر آتے ہیں۔ لوگ ان میں پانی جمع کر لیتے ہیں۔ مویشی سایہ دار جگہوں پر آرام کرتے ہیں۔ مقامی لوگ رات کو ان کی حفاظت میں سو جاتے ہیں۔ یہ اپنی زمین اور ہواؤں میں زندہ ہیں۔ اپنے باپ دادا کی دھرتی سے عشق کرتے ہیں اور سو جاتے ہیں مگر ہجرت نہیں کرتے۔

پہاڑیوں کی چڑھائی کے بعد گورکھ کا ہل اسٹیشن شروع ہوتے ہی ہموار میدان اور سرسبز چراگاہیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ہواؤں میں گھاس اور جڑی بوٹیوں کی بھینی بھینی مہک پھیل جاتی ہے۔ سرسبز قالین نما گھاس پر پیدل چلنے کا اپنا ہی مزا ہے۔ سب سے بلند چٹان پر لوہے کی جالیاں لگا دی گئی ہیں جہاں سے دُور پار دیکھیں تو پہاڑی سلسلے عجیب دل کشی دکھاتے ہیں۔ چٹانوں پر باغات اور جنگل پھیلے ہوئے ہیں۔ سرسراتی گھاس میں ٹھنڈی ہواؤں کا راج ہے۔ موسم گرما کی راتیں بھی انتہائی یخ بستہ ہوتی ہیں۔

گورکھ کی صبح کا منظر ناقابلِ یقین ہوتا ہے۔ جب رات کو بارش ہونے کے بعد جنگل کے پہاڑ نکھر جاتے ہیں، گیلی اور نرم پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے خمار طاری ہونے لگتا ہے۔ پنیر، بادام اور کھو کے درختوں کی خوشبو پھیل جاتی ہے۔

یہاں پر الپائن(Alpine)، فلورا(Flora) اور فونا(Fauna) کے پودے بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں سولر انرجی اور ونڈ انرجی بھی کافی مقدار میں پیدا کرنے کی طاقت بھی ہے۔

کھیرتھر پہاڑوں پر جو سب سے زیادہ اونچا مقام ہے وہ 7056 فٹ ہے۔ کھیرتھر کے مقام پر اور بھی بہت سے اونچے مقامات ہیں جن میں کھوہ بے نظیر، کھیرتھر نیشنل پارک، ڈائنو سارز اسکیلٹن (Skeleton Dinasours) اور صحرا بھی بہت مشہور ہیں۔

جو لوگ سندھ کے اکلوتے ہل اسٹیشن، گورکھ ہل کا صرف نام سنتے آئے ہیں، ان کے لیے خوش خبری ہے کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک خوب صورت سڑک مکمل ہو چکی ہے اور اب جب جی چاہے دادو شہر سے صرف تین گھنٹے کی مسافت طے کر کے سطح سمندر سے ساڑھے پانچ ہزار فٹ سے زائد اس بلند مقام تک بآسانی جا سکتے ہیں۔ پہلے اس جگہ پہنچنا بہت مشکل ہوتا تھا مگر اب ہیلی کاپٹر سروس کی شروعات ہونے کے بعد سے یہاں جانا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اب کراچی سے دادو کے لیے دن میں کئی بار ایئر کنڈیشنڈ کوچز روانہ ہوتی ہیں مگر سب سے بہتر وقت رات ایک بجے کا ہے۔ اس طرح سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ آپ اس پُرسکون شہر میں وارد ہوتے ہیں۔

بس اڈے کے پاس پوریاں تلتے ہوٹل والے مسافروں کو مخصوص انداز میں بلانے لگتے ہیں۔ بہار کی اس اوس بھری صبح میں سنہری حلوے کا مزہ منہ میں گھلنے لگتا ہے اور گرم چائے کا ایک کپ پیتے ہی سیاح کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔

یہ شہر جو صدیوں پہلے ایک زمین دار دادن شاہ گوٹھ کے نام سے تھا، آہستہ آہستہ ایک حسین شہر کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ کشادہ سڑکوں پر مکھی مچھروں کی طرح بھنبھناتے موٹر سائیکل رکشا والے مسافروں کو دیکھتے ہی لکیں مارنے لگتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مگر بھرے ہوئے بازاروں میں رات کسی خوشبو کی طرح مہکتی ہے اور سیاح سندھ کی قدیم ثقافت سے سرشار میٹھے بولوں کی سریلی گھنٹیاں سنتا پہروں گھومتا پھرتا ہے۔ بازار میں ہی رہائش کے لیے کئی ہوٹل مل جاتے ہیں۔ برصغیر میں گورکھ ہل اسٹیشن تیسرے نمبر پر پُرفضا سیاحتی مرکز ہے۔

گورکھ ہل پر برفباری نے منظر بدل دیئے ہیں۔ سندھ کے ضلع دادو میں واقع گورکھ ہل اسٹیشن پر سیزن کی پہلی برف باری نے منظر کو دل کش بنا دیا ہے۔ ملک بھر میں سردی کی لہر کے بعد ڈھائی ہزار ایکڑ پر پھیلے گورکھ ہل اسٹیشن پر صبح کے وقت جب برف باری ہوتی ہے تو چٹانیں سفید چادر اوڑھ لیتی ہیں اور منظر انتہائی سہانا ہو گیا۔ گورکھ ہل اسٹیشن پر درجہ حرارت رات کے وقت منفی پانچ ڈگری سینٹی گریڈ ہو جاتا ہے۔ 2008ء میں ہونے والی برف باری سے پورا علاقہ برف سے ڈھک گیا تھا جب کہ 2002ء میں بھی اس مقام پر برف باری ہوئی تھی۔ دشوار راستے سیاحوں کے لیے رکاوٹ ہیں۔ ہزاروں فٹ کی بلندی پر جانے کے لیے لوگ مقامی ڈرائیورز سے ہی مدد حاصل کرتے ہیں۔

☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 ر اکتوبر 2015ء ہے۔

ستمبر 2015ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- ارے نادانو! گاڑی نہیں انسانوں کو بچاؤ (صفی الرحمٰن، لاہور)
- سیلاب آیا بستی میں ہم اپنی مستی میں (محمد بدر، راول پنڈی)
- ہمتِ مرداں، مددِ خدا (عائشہ ذوالفقار، لاہور)
- لکڑی کے سنگ لوہا تیرے (نجم السحر، منڈی بہاؤ الدین)
- جھوٹے وعدے جھوٹی تسلیاں دینا کام ہے میرا
بیچ منجدھار عوام کو چھوڑ جانا شعار ہے میرا (محمد حمزہ لغاری، میانوالی)

ہونہار مصور

یوم دفاع

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔
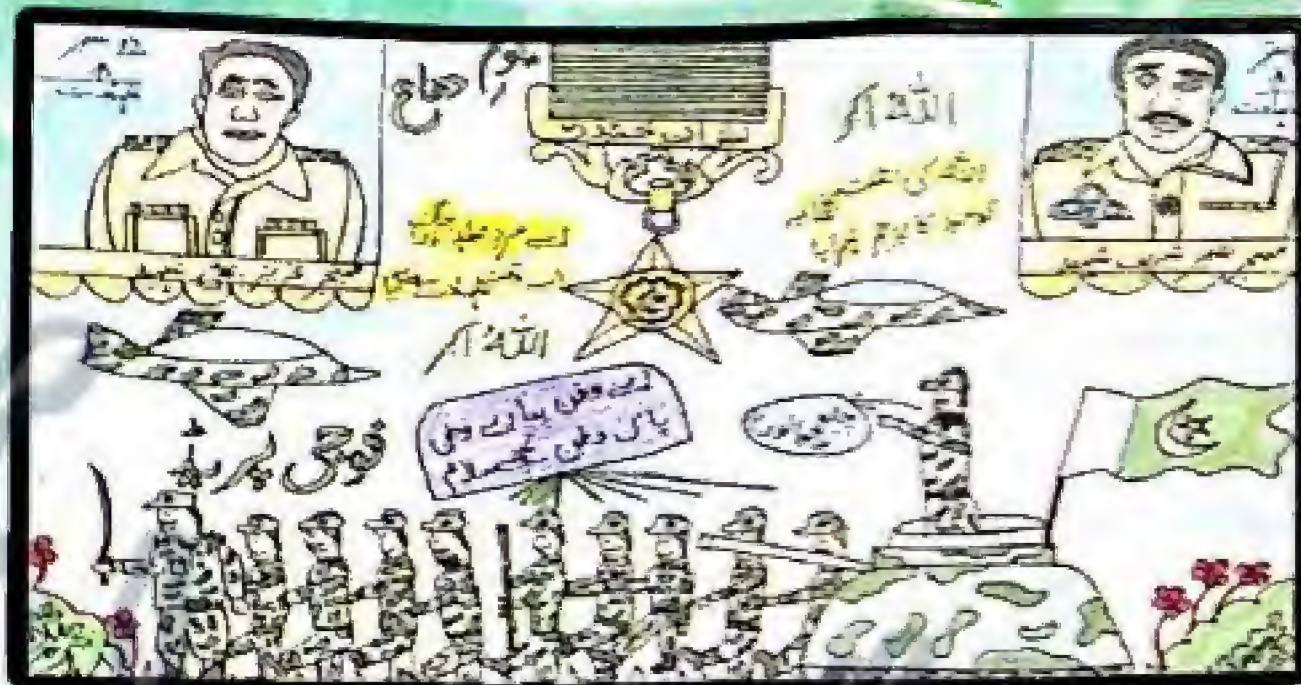
سیدہ تحریم مختار، لاہور (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

محمد اسد اللہ، فیصل آباد (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

جویریہ یونس، لاہور (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

خدیجہ نعیم، لاہور (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

عبداللہ ارشد، گوجرانوالہ (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: سمیعہ توقیر، کراچی۔ محمد عبداللہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ حسنہ یاسر گوندل، کشف طاہر، جویریہ یونس، لاہور۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ وجیہہ شفقت، اکوڑہ خٹک۔ حضرت امین، ملتان۔ خدیجہ سلیم، پیرمحل۔ زین احمد قریشی، فیصل آباد۔ محمد عثمان جاوید، واہ کینٹ۔ صدف شاہین، لاہور۔ مبشرہ نسرین، لاہور۔ نوید، فیصل آباد۔ راحیلہ ناز، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ثانیہ نور، کراچی۔ ثناء حسن، ملتان۔ آمنہ کریم، راولپنڈی۔ زاہدہ مظفر، پشاور۔ نبیل احمد، لاہور۔ نورین نیازی، کراچی۔ مجاہد خان، کوہاٹ۔ دانیال منصور، لاہور۔ شکیل احمد، پیرمحل۔ فائزہ سلمان، اسلام آباد۔ فرزانہ نسرین، کراچی۔ محسن، خان پور۔ عاتکہ، چونیاں۔ محمد حبیب، لاہور۔ اسماء شکیل، فیصل آباد۔ دانش حسین، کوہاٹ۔ اصغر علی، عارف والا۔ نعیم شہزاد، لاہور۔ ماجد، کینٹ۔ عظیم سرور، ملتان۔ کرن، بہاول پور۔ ابراہیم، کوئٹہ۔ سدرہ محمود، کاموکی۔ سرفراز اقبال، لاہور کینٹ۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آخری تاریخ 8 اکتوبر

آخری تاریخ 8 نومبر

PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY